ماہنامہ
بیداری
حیدر آباد

جلد انیسواں ◯ اپریل- مئی 2025
قیمت: 25روپے، سالانہ: 300روپے

مدیر
☆☆☆
حافظ محمد موسیٰ بھٹو

موبائل نمبر:
03463216078

زیر اہتمام
☆☆☆
سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ
400-بی لطیف آباد4-حیدر آباد
E-MAIL
m.moosabhutto@gmail.com
www.bedarimillat.com

قرآن کا پیام (مستقل سلسلہ)	محمد موسیٰ بھٹو	۲
ہمارے نام		
انسانی شخصیت میں کارفرما قوتیں	محمد موسیٰ بھٹو	۱۷
اور خوشگوار زندگی کی صورت		
جدید انسان		۲۰
مادیت کے عالمگیر اثرات کی زد میں		
کیا جدید سائنسی دور نے توہمات کا خاتمہ کر دیا؟	شاہنواز فاروقی	۲۳
غلط خبریں پھیلانے کی وبا!	مفتی سید انور شاہ	۲۸
دور حاضر میں جھوٹ کی نئی صورتوں کا نکل آنا		
اہل اللہ کے ایمان افروز واقعات	پروفیسر ڈاکٹر غلام سکینہ شیخ	۳۴
مسلمانوں کے کرنے کا کام	مولانا سید محمد الحسنی	۴۱
اسلام قبول کرنے والے کچھ جاپانیوں کے حالات	محمد عرفان صدیقی	۴۷
شاہ ولی اللہ صاحب کے تجدیدی کارنامے	حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی	۵۰
گناہ سے جذبہ حمیت و غیرت کا فنا ہونا	امام ابن القیم الجوزیہ	۵۹
محاسبہ نفس کی اہمیت	محمد صفوان قاضی	۶۳
ہمارے کچھ اہم معاملات (مستقل سلسلہ)	محمد موسیٰ بھٹو	۶۷
احادیث نبوی کی روشنی میں		

پبلشر: محمد موسیٰ بھٹو نے یادگار پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ 400بی لطیف آباد-4-حیدر آباد سے شائع کیا

محمد موسیٰ بھٹو

قرآن کا پیام

ہمارے نام

یہ اور اس طرح کی دوسری قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکوکاروں کے ساتھ اس دنیا میں بھی اللہ کی مدد شامل ہوتی ہے تو آخرت میں بھی۔ یہ کتنا بڑا انعام ہے ایمان واعمال کے صاحب افراد پر۔ لیکن یہ انعام انہی افراد کو حاصل ہوتا ہے، جو اللہ کو اپنا رب کہکر اس پر جم جاتے ہیں اور ادھر ادھر دیکھنے کے روادار نہیں ہوتے، نیز وہ ہر قسم کے طاغوت سے انکار کی روش اختیار کرتے ہیں، یہ طاغوت نفس کی خواہشات کی صورت میں ہو یا مادیت پسند قوتوں کی شکل میں، وہ دولت دنیا کی صورت میں ہو یا دوست واحباب اور عزیز واقارب کی صورت میں، وہ اللہ کی اطاعت اور اس کی محبت کے مقابلے میں کسی سے بھی مصالحت اختیار نہیں کرتے۔

آج ہماری جو حالت ہے وہ ہر اعتبار سے قابل رحم ہے کہ دنیا کی مادہ پرست قومیں ہم پر اس طرح ٹوٹ پڑی ہیں، جس طرح بھوکا کھانے کے دستر خوان پر ٹوٹ پڑتا ہے، ایمان کے دعویٰ کے باوجود ہماری یہ حالت اس لئے ہے کہ ہم نے طاغوت سے مصالحت اختیار کر لی ہے، دنیاوی مفادات ہمارا مقصود بن گئے ہیں، ہم نے اللہ کو رب کہکر اس پر جم جانے سے روگردانی کی روش اختیار کی ہے، اللہ کا وعدہ تو اب بھی موجود ہے، اپنے کمزور ایمان اور اعمال کی حالت کو بدلنے کی ضرورت ہے، نفس اور مادیت کے طاغوت سے دستبردار ہونے کی صورت میں ہی ہم اس وعدے کے مصداق ہو سکتے ہیں۔

خوشی، حلاوت، سعادت، خوشحالی، کامیابی، دنیا میں دوسری قوموں کے مقابلے میں عزت ووقار شان ومان کی زندگی یہ ساری چیزیں اللہ سے وفاداری کے عہد کو پورا کرنے کی صورت میں ہی حاصل ہو سکتی ہیں، اللہ کی طرف سے اتنی خوشخبری کے باوجود قوموں کی سطح پر ذلت کی زندگی بسر کرنا، یہ عبرت کا مقام ہے، کاش کہ ہم اللہ کے وعدے پر یقین کر کے ایمان اور اعمال صالحہ کی راہ اختیار کریں۔

انسان اور اس کے دل کے درمیان اللہ کا حائل ہونا

اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ۔ (سورۃ الانفال آیت ۲۴) (جان لو کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے) ۔

انسانی شخصیت میں دل کو مرکزی مقام حاصل ہے، یہ دل ہی ہے جو اللہ کے انوار کو اخذ کر کے پوری انسانی شخصیت کی طرف ان انوار کے اجزاء کو منتقل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، اس لئے حدیث قدسی میں فرمایا گیا ہے کہ میں کائنات کی کسی چیز میں نہیں سما سکتا سوائے بندہ مومن کے دل میں۔

جب دل کو بنانے اور اسے اللہ کے انوار کا مرکز بنانے کے کام سے غفلت برتی جاتی ہے اور غفلت کا دورانیہ بڑھ جاتا ہے تو دل پر نفس کا دیو قابو پا کر اسے اپنی خواہشات کا مرکز بنا لیتا ہے، اس طرح بندے کا دل اللہ سے دور سے دور تر ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک دل کی پاکیزگی اور اس کا پاکیزہ احساس سلب ہو جاتا ہے اور دل کی دنیا ویران ہو جاتی ہے، دل کی اس حالت کو انسان اور اس کے دل کے درمیان اللہ کے حائل ہونے سے عبارت فرمایا گیا ہے۔

جب اللہ، انسان کے دل کے درمیان حائل ہو جائے تو پھر بندے کے دل کے دروازوں کا کھلنا ناممکن ہو جاتا ہے، اگرچہ توبہ اور رجوع سے راستے کھل جاتے ہیں، لیکن رجوع کے سلسلے میں بھی پردے حائل ہو جاتے ہیں۔

حکمت کا خیر کثیر ہونا

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ (سورۃ البقرہ آیت ۲۶۹) (اور جس کو حکمت دی گئی اسے بڑی نعمت عطا فرمائی گئی)۔

حکمت دراصل فہم وفراست کے لئے سینے کو کھول دینے کا عمل ہے۔

حکمت سے وہ استعداد حاصل ہوتی ہے، جس سے فرد اچھے اعمال اور بُرے اعمال کے درمیان تمیز کرنے اور ان دونوں اعمال کی نوعیت کو سمجھنے میں کامیاب ہوتا ہے، اور اس کی باطنی حس اتنی بیدار ہوتی ہے کہ اس پر نئے نئے علوم اور نکات کا ورود ہونے لگتا ہے۔

اس حکمت کی راہ میں اصل رکاوٹ نفس کی قوت ہوتی ہے، نفس کی قوت کو مجاہدوں سے ہٹانے کی قیمت پر ہی یہ حکمت عطا ہوتی ہے۔

حکمت کا لازمی نتیجہ بندے کی آخرت کے بارے میں غیر معمولی حساسیت ہوتی ہے کہ فرد کا دل آخرت کی طرف اٹکا رہتا ہے کہ وہاں کی تیاری ہو، حقیقی دانشمندی بھی یہی ہے کہ قطرے کے مقابلے میں سمندر کو ترجیح دی جائے، حکمت اور دانشمندی بندے کو ابدی زندگی کی تیاری کے لئے غیر معمولی طور پر فکر مند کر دیتی ہے، فرد کی زبان سے نئے نئے دانشمندانہ نکات کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔

اللہ کا امن وسلامتی کے گھر کی طرف بلانا

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ۔ (سورۃ یونس آیت ۲۵) (اور اللہ تمہیں سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے) ۔

کتنا شفیقانہ اسلوب بیان ہے کہ بندے کو کہا جارہا ہے کہ تم میرے سلامتی کے گھر یعنی جنت میں داخل ہونے کے لئے آؤ، وہاں تمہاری خوب عزت افزائی کی جائے گی، بہت ساری نعمتوں کے ساتھ ساتھ وہاں تمہیں میرا دیدار بھی ہوگا، تم مجھے انہی آنکھوں سے دیکھو گے،

جس سے تمہارے جذبات حسن کی آخری حد تک تسکین ہوگی، لیکن میرے سلامتی کے اس گھر میں داخلے کے لئے اعمال صالحہ اور میری اطاعت کو وظیفہ بنانا ہوگا، جان ومال کی قربانی دینا ہوگی، دوسرے الفاظ میں اپنے نفس کی قوتوں کو فنا کر کے اسے مکمل طور پر میری اطاعت میں دینا ہوگا۔

نفس پرست افراد سے تعلقات کا سم قاتل ہونا

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى۔ (سورۃ طٰہٰ آیت ۱۶) (پس جو شخص ایمان نہیں رکھتا اور خواہش کا پیروکار ہے کہیں وہ تمہیں اس سے روک نہ دے (اگر ایسا ہوا تو) تم ہلاک ہو جاؤ گے) ۔

یہ آیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے ہے، اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے ہمیں کہا جارہا ہے کہ خواہشات کے پیروکار اور آخرت سے اعراض کرنے والے افراد سے کسی بھی صورت میں ودوستانہ تعلقات قائم نہ ہوں، ورنہ تم ہلاکت سے دوچار ہوگے، اس لئے کہ اس طرح کے افراد سے دوستانہ تعلقات سے ان کے فکری اثرات اور ان کے رنگ کو قبول نہ کرنا دشوار ہوتا ہے، اس لئے فرمایا گیا ہے کہ فرد کو اگر دیکھنا چاہتے ہو کہ وہ کس راستہ پر گامزن ہے تو اس کے دوست کو دیکھو کہ اس کا دوست کس ذہن اور مزاج کا حامل ہے۔

فرد اصل میں دوست کے دین پر ہوتا ہے اور دوست کی طرز زندگی پر قائم ہوتا ہے، اس لئے کسی سے گہرے تعلقات قائم کرنے میں احتیاط انتہائی ضروری ہے، ورنہ فرد ایمانی اعتبار سے حالت خطرہ سے دوچار ہوگا۔

موجودہ دور میں سوشل میڈیا کے ذریعہ افراد کو عام طور پر جو ماحول میسر ہے، وہ سیکولر ذہن اور آزاد خیالی کا ماحول ہے، دین اور دینی زندگی کو اہمیت نہ دینے والا ماحول ہے، دوسرے الفاظ میں دنیادارانہ اور مادیت پسندی پر مشتمل ماحول ہے، یہ ماحول بھی ایسا ہے، جو فرد کے ایمان کے لئے خطرے سے خالی نہیں ہے، اس ماحول کو بھی دوستانہ تعلقات ہی سے عبارت کیا جائے گا۔

سلامتی اس میں ہے کہ اس طرح کے ماحول کے اثرات سے ہر ممکن حد تک بچنے کی کوشش ہو، قرآن کی مذکورہ آیت اس سلسلے میں ہمارے لئے انتباہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

بتوں کی پوجا سے بچنے کی دعا

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ (سورۃ ابراہیم آیت ۳۵)

(اور یاد کر جب ابراہیم نے عرض کی اے میرے پروردگار اس شہر کو امن والا بنادے اور مجھے اور میرے بچوں کو بتوں کی پوجا سے بچالے اے میرے پروردگار، ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کردیا ہے)۔

اس آیت سے ایک بات جو معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ جب اللہ کی شان عظمت کا قریبی مشاہدہ ہوتا ہے تو اپنی شخصیت مٹ جاتی ہے اور خشیت غالب ہو جاتی ہے، اور شخصیت عبدیت کے رنگ میں رنگ جاتی ہے، اور اللہ سے ہر طرح کے فتنوں سے بچاؤ کے لئے پناہ مانگنے کی نفسیات پختہ ہونے لگتی ہے۔

اُس دور میں بت پرستی کا فتنہ بہت زیادہ تھا، جس نے لوگوں کا احاطہ کیا ہوا تھا، اس لئے اللہ کے خلیل نے اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے بت پرستی سے بچنے کی دعا فرمائی۔ موجودہ دور کا سب سے طاقتور فتنہ جو بت پرستی سے زیادہ طاقتور ہے، وہ مادیت پرستی کا بت اور فتنہ ہے، عالمی سطح سے لے کر قوموں کی سطح تک مادیت کی روح اس تیزی سے پھونکی جارہی ہے کہ انسانوں کی بڑی اکثریت اس کی زد میں آگئی ہے، دنیاوی زندگی کو بہتر اور لذیذ سے لذیذ تر بنانے کا جنون ہے، جس نے انسانیت کو پامال کردیا ہے اور خدا پرستی کی راہ سے دور کردیا ہے، مادیت پرست قوموں نے جنہیں دنیا کی قیادت وسیادت حاصل ہے، انہوں نے مادیت پرستی کے بت کو اتنا عام کردیا ہے کہ لوگ اس آرزو میں جیتے ہیں کہ کاش کہ انہیں مادی زندگی کی ساری لذتیں حاصل ہوں، سیکولرزم (آزاد خیالی) کا فتنہ بھی مادیت پرستی ہی کا شاخصانہ ہے۔

ہمیں اس دور کے سب سے بڑے فتنے سے بچاؤ کے لئے اللہ سے دل کی گہرائیوں سے دعا کرتے رہنا چاہئے، لیکن عملی طور پر اس کے لئے اللہ کی محبت کی راہ اختیار کرنا ضروری ہے، اللہ کی محبت میں جو حلاوت اور اجزائے حسن موجود ہیں، وہ ایسے ہیں کہ وہ فرد کو مادی طرز زندگی کی اداؤں اور مادیت پسندی سے بلند کردے گی۔

اللہ کے فضل خاص کے بغیر نفس کے سنورنے کے عمل کا نہ ہونا

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ۔ (سورۃ النساء آیت ۴۹)

(کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو پاکباز کہتے ہیں، (نہیں) بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاکیزہ کرتا ہے) ۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰي مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ۔ (سورۃ النور آیت ۲۱)

(اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی تو تم میں سے ایک شخص بھی پاک نہ ہوتا، مگر اللہ جس کو چاہتا ہے پاک کردیتا ہے) ۔

یہ دو آیتیں تزکیہ کے حوالے سے بڑی اہم آیات ہیں، اپنے آپ کو پاکباز سمجھنے کی سخت ممانعت ہے، ایسا فرد چاہے وہ بظاہر پاکیزگی کے کتنے ہی بلند مقام پر فائز ہو، وہ پاکیزگی کی حالت سے گرادیا جاتا ہے، اس لئے کہ یہ اپنے بڑے اور بہتر ہونے اور اپنے آپ کو افضل سمجھنے کے مقام پر فائز کرنے والی بات ہوتی ہے۔

حقیقی بندہ مومن کی تو حالت یہ ہوتی ہے کہ تزکیہ یعنی نفس کو سنوارنے کے معاملے میں وہ جتنا آگے بڑھتا ہے، اس میں اسی قدر عاجزی اور اپنے سیاہ کار ہونے کا احساس غالب ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو کسی مقام و مرتبہ کا حامل تو کیا سمجھے، اس کی نفسیات تو یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کے گناہ معاف ہو جائیں، وہ اللہ کے عذاب اور عتاب سے بچ جائے تو یہ اس کے لئے سب سے بڑی کامیابی ہو گی۔

اللہ کی محبت کی راہ ایسی ہے کہ اس میں اللہ کی شان عظمت کے زیر اثر بندہ، نفس کی قوتوں سے خائف رہتا ہے کہ کہیں وہ اسے اللہ سے دور نہ کر دیں، کہیں وہ اسے گناہوں میں مبتلا نہ کر دیں، اس سلسلے میں بندہ آخر وقت تک خوفزدہ ہوتا ہے، اس لئے اپنے آپ کو پاکباز سمجھنا حقیقی بندہ مومن کے شان کے بالکل منافی ہے۔

قرآن کی دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اگر تمہارے ساتھ اللہ کا فضل شامل نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی بھی پاک نہیں ہو سکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ بندہ مؤمن، زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کے فضل خاص کا محتاج ہے، اس کے فضل کے بغیر وہ صحیح راہ پر گامزن ہی نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ نفس اور مادیت پسندی کی قوتیں اتنی طاقتور ہیں کہ وہ اس کو متزلزل کر دیتی ہیں، یہ اللہ کا فضل ہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے بندے کو ان قوتوں کے حملوں سے بچا کر نیکی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔

قرآن کی یہ دونوں آیتیں ایسی ہیں جو بندہ کو لرزا دینے کا ذریعہ بن سکتی ہیں کہ وہ اپنے مجاہدوں اور اپنی عبادت پر ناز نہ کرے اور نہ ہی اپنے معتقدین کی کثرت سے غلط فہمی کا شکار ہو کہ وہ تو اب پہنچ چکا ہے۔

ہدایت کا، اللہ کی طرف رجوع ہونے سے وابستہ ہونا

اِلَیۡہِ مَنۡ اَنَابَ اِلَیَّ ۔ (سورۃ الرعد آیت ۲۷) (اللہ تعالیٰ اپنے راستے کی طرف انہی کو لاتے ہیں جو اس کی طرف رجوع کریں)۔

وَیَهۡدِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یُّنِیۡبُ ۔ (سورۃ الشوریٰ آیت ۱۳) (اور اللہ اپنی طرف ہدایت دیتا ہے (اس کو) جو اس کی طرف رجوع ہوتا ہے)۔

ان دونوں آیتوں میں ہدایت کے لئے شرط بیان فرمائی گئی ہے کہ اس کے لئے فرد اللہ کی طرف رجوع ہو، اور دل کی چاہت ہو کہ وہ نیکی کی راہ پر گامزن ہو، اور وہ اسلام پر عمل پیرا ہو، اس طرح طلب، رجوع اور چاہت کے بغیر ہدایت اور اللہ کے راستے پر چلنے کی سعادت حاصل نہیں ہوتی۔

یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ رجوع یعنی حقیقی چاہت کے بغیر رجوع الی اللہ کے راستے نہیں کھلتے اور اس کی صورت پیدا نہیں ہوتی، رجوع ہونا، فرد کا اپنا کام ہے (یعنی طلب کا ہونا) اس کے بعد ہدایت کی راہ پر گامزن کرنا اور اس کی توفیق عطا فرمانا، یہ اللہ کا کام ہے، دیکھا گیا کہ فرد، افراد کے بارے میں سخت کوشاں ہوتا ہے کہ وہ دین کی طرف آئیں، اللہ کی محبت کی راہ اختیار کریں اور ایمان و یقین کی حالت پر گامزن ہوں، لیکن فرد کی کوششوں کے باوجود ایسا نہیں ہوتا، اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ افراد کے دل میں طلب اور چاہت نہیں ہوتی، اور ان کا دل رجوع ہونے سے خالی ہوتا ہے، جس کی وجہ سے توفیق نصیب نہیں ہوتی۔

جب تک گھر اور گھر سے باہر ماحول صحیح نہ ہو گا اور جدید میڈیا سے چھٹکارہ حاصل نہ ہو گا، تب تک رجوع والی نفسیات کا پیدا ہونا دشوار تر ہے، بہر حال بندہ مؤمن کو اس سلسلے میں اپنی حد تک کوشش جاری رکھنی چاہئے کہ لوگ اللہ کی طرف رجوع ہوں، رجوع ہونے کے فور ابعد اللہ کا فضل خاص شامل ہونے لگتا ہے اور فرد نیکی کی راہ پر مستعدی سے چلنے لگتا ہے۔

رجوع والے دل کے صاحب کے لئے
سلامتی سے جنت میں داخل ہونے کا ذکر

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ۔ (سورۃ ق آیت ۳۳ ۔۳۴) (جو شخص بن دیکھے رحمٰن سے ڈرتا رہا رجوع والا دل لے کر آیا (اسے کہا جائے گا کہ) سلامتی سے جنت میں داخل ہو جاؤ)۔

اس آیت میں متوجہ الی اللہ ہونے والے دل کا ذکر ہے کہ اس کے لئے سلامتی سے جنت میں داخل ہونے کی وعید ہے، دل کا اللہ کی طرف مکمل طور پر رجوع ہونا اور اللہ کے لئے پوری طرح یکسو ہونا، یہ بہت بڑی سعادت کی بات ہے، یہ سعادت دل کو بنانے اور اسے سنوارنے کے لئے مجاہدے کرنے والوں کو ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ دل کا، نفس کی یرغمالی سے بچ کر مکمل طور پر اللہ کی طرف راغب اور رجوع ہونا، یہ آسان کام نہیں ہے، اس کے لئے دل پر سخت محنت کی ضرورت ہے، دل محنت سے ہی بنتا ہے، جب ایک بار دل متوجہ الی اللہ ہونے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو گیا تو اس کے بعد اس راہ پر گامزن ہونا، دل کے لئے زیادہ مشکل نہیں، اس لئے کہ اس سے دل حلاوت سے سرشار ہونے لگتا ہے۔

یہ نکتہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ دل کے متوجہ الی اللہ ہونے کا معیار اور پیمانہ اعمال صالحہ ہی ہیں، جب اعمال صالحہ سے دل کی مناسبت پیدا ہونے لگتی ہے، اور اعمال صالحہ کے بغیر دل رہ نہ سکے تو کہا جائے گا کہ اب دل پوری طرح متوجہ الی اللہ ہو گیا ہے، انسانی شخصیت دراصل دل ہی کے تابع ہوتی ہے، دل اگر متوجہ الی اللہ ہونے کی صلاحیتوں سے پوری طرح بہرہ ور ہے تو اس کے نتیجے کے طور فرد کی ساری شخصیت پر اللہ کا رنگ غالب ہو گا، ایسی شخصیت کو کہا جائے گا کہ تم سلامتی سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔

دلوں میں مرض کی صورت میں
نصیحت کا کارگر نہ ہونا

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۔ (سورۃ البقرہ آیت ۱۰) (ان کے دلوں میں مرض ہے اللہ نے ان کے مرض کو بڑھا دیا) ۔

جب دلوں میں کفر، شرک، منافقت یا بڑے پن کا مرض موجود ہو تو نصیحت کی باتیں سننے کے باوجود اس مرض میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے، جب تک دل کو ہر طرح کے امراض سے خالی کرنے کے لئے سنجیدگی اختیار نہ کی جائے اور دل کو اللہ کی باتیں سننے کے لئے آمادہ نہ کیا جائے، تب تک ہدایت کا راستہ نصیب نہیں ہوتا، اس آیت میں یہ بنیادی بات فرمائی گئی ہے۔

چونکہ یہ باطنی معاملہ ہے، اس لئے عام طور پر اس کی نوعیت کو سمجھنے اور اس کی اصلاح سے غفلت برتی جاتی ہے، یہ غفلت دل کو امراض کا شکار بنا دیتی ہے، اس سے دل میں ضد اور کج بحثی کی حالت پیدا ہونے لگتی ہے اور اس کی صلاحیت مضمحل ہو جاتی ہے، نیز فرد حق وصداقت کو عقل کے پیمانے سے ناپنے لگتا ہے، دل کی روشنی سے محروم عقل تو نفس کی یرغمال شدہ ہوتی ہے جو حق سے انکار کی راہ پر گامزن ہوتی ہے۔

بھائیوں کے درمیان صلح کرانے کی تاکید

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ۔ (سورۃ الحجرات آیت ۱۰) (مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں تو اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو) ۔

اس آیت میں مؤمن کی آپس میں بھائیوں والی حیثیت کو اجاگر فرمایا گیا ہے، ایمان سے جو ملت تشکیل پاتی ہے، وہ دراصل بھائیوں پر مشتمل ہوتی ہے، بھائیوں کے لئے ایک

دوسرے سے محبت کا ہونا، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا، ایک دوسرے کا احترام کرنااور معاونت کرنا، اگران کے درمیان غلط فہمی کی وجہ سے یا کسی مسئلے کی وجہ سے رنجش اور دوری پیدا ہو جائے تو ان کے درمیان مصالحت کرانا، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو بھائی ہونے کی خصوصیات میں شامل ہیں۔

موجودہ نفسا نفسی کے دور میں ہم نے اپنے بھائیوں کے مسائل ومشکلات کی نوعیت کو سمجھنے اور انہیں دور کرنے سے اعراض کی روش اختیار کرلی ہے اور ہر فرد اپنے ہی مسائل میں الجھ کر رہ گیا ہے، جس کی وجہ سے امت پر مشتمل برادری کی حالت قابل رحم ہوگئی ہے۔

زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کا لکھا جانا

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ۔ (سورۃ ق آیت ۱۸) (اس کی زبان سے کوئی بات نہیں نکلتی، مگر ایک نگہبان اس کے پاس (لکھنے کے لئے) تیار ہوتا ہے) ۔

یہ آیت ایسی ہے جو بندہ مؤمن کو لرزا دینے کا ذریعہ بن سکتی ہے کہ اس کی زبان سے نکلنے والی ہر بات لکھی جاتی ہے اور اسے محفوظ کیا جاتا ہے، ہم روزانہ زبان سے سینکڑوں قسم کی باتیں کرتے ہیں، جن میں سے ۹۸ فیصد باتیں ایسی ہوتی ہیں جو غیر ضروری ہوتی ہیں، ان میں گلا، غیبت اور دوسروں کی تحقیر شامل ہوتی ہے، اس طرح ہمارے نامہ اعمال میں فضول باتوں کا پلڑہ اتنا بھاری ہو جاتا ہے کہ دوسرے پلڑے پر حاوی ہو جاتا ہے، خطرہ ہے کہ ہماری نیکیاں فضول باتوں کی نذر نہ ہو جائیں، اس لئے گفتگو کے سلسلے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے، زبان اتنی شہ زور ہے کہ بس وہ مسلسل بولتے رہنا چاہتی ہے، اس سے اسے لذت حاصل ہوتی ہے، زبان کی اس لذت سے ذکر سے حاصل ہونے والی لذت ہی بچا سکتی ہے، اس لئے زبان پر کنٹرول کے لئے ذکر میں مصروفیت ضروری ہے۔

اللہ کے لئے کوشاں رہنے والوں کی اللہ سے ملاقات کا ذکر

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ - (سورۃ الانشقاق آیت ۶) (اے انسان، تو اپنے پروردگار کی طرف پہنچنے میں خوب کوشاں رہتا ہے، پس تیری اس سے ملاقات ہو کر رہتی ہے)۔

بندہ مؤمن اللہ کے لئے مجاہدوں سے کام لیتا ہے، نیک اعمال کے لئے کوشاں ہوتا ہے، راہ محبت کی منزلیں طے کر کے نفس کو پامال کرنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، وہ ہر طرح کے طاغوت (غیر اللہ) سے منقطع ہوتا ہے، گناہوں سے بچنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، ساتھ ساتھ وہ اللہ کے لئے تڑپتا رہتا ہے، نفس کی اکساہٹ سے وہ گرتا ہے، گر کر پھر اٹھتا ہے اور اللہ کی محبت کی راہ میں چلنے لگتا ہے، اس کی ساری جد وجہد کا مقصد اللہ کو پانا ہوتا ہے، اس کا دل اللہ کے خوف سے لرزاں رہنے لگتا ہے۔

اس طرح کے بندے سے فرمایا جارہا ہے، تمہاری اللہ کے لئے یہ ساری کوششیں ہماری نظروں میں ہیں، تمہاری اللہ سے ملاقات ہو کر رہے گی اور تمہاری سعی اور خشیت کی بدولت ابدی انعام سے نوازا جائے گا۔

بندہ مومن جب قرآن کی یہ آیت پڑھتا ہے تو اسے حوصلہ ملتا ہے کہ اللہ بہت قدردان ہے، وہ اس کی محنت کو کسی طرح رائیگاں جانے نہیں دے گا، نیز اس کے مجاہدوں میں ہونے والی کمی وکوتاہیوں کو بھی معاف فرمادے گا۔

اللہ پر ایمان سے نقصان کے خوف وخطر سے محفوظ ہونا

فَمَن يُؤْمِنۢ بِرَبِّهِ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَلَا رَهَقًا۔ (سورۃ الجن آیت ۱۳) (اور جو شخص اپنے رب پر ایمان لاتا ہے تو اسے نہ کسی نقصان کا خوف ہوتا ہے اور نہ ظلم کا)۔

اس آیت میں اللہ پر ایمان سے ایک اور بڑی نعمت حاصل ہونے کی نوید سنائی گئی ہے، فرمایا گیا ہے کہ ایسا فرد نقصان کے خوف وخطر اور ظلم سے محفوظ ہوتا ہے۔

بندہ مؤمن کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ اس پر صرف اللہ کا خوف طاری ہوتا ہے، یہ خوف اس پر اس قدر غالب ہوتا ہے کہ دنیا کے سارے خوف وخطر اس کی دل کی حالت میں تشویش پیدا کر کے اسے بے قابو نہیں ہونے دیتے۔

اگرچہ دنیا میں رہتے ہوئے مسائل ومشکلات اسے بھی درپیش ہوتی ہیں، لیکن اللہ کی ذات پر یقین کی حالت کے استحکام کی وجہ سے اس طرح کی مشکلات سے اس کے دل کی حالت خوف زدگی سے محفوظ ہوتی ہے۔

اس آیت کا دوسرا مفہوم آخرت کے حوالے سے ہے کہ آخرت میں بندہ مومن ہر طرح کے نقصان کے خوف سے محفوظ ہوگا اور نہ اس پر کوئی ظلم ہوگا۔

مجاہدوں کے ذریعے راستہ نکال کر دینے کے وعدے کا ہونا

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (سورۃ العنکبوت آیت ۶۹) (جو ہمارے لئے مجاہدوں سے کام لیتے ہیں ہم ان کو راستے نکال کر دیتے ہیں)۔

اس آیت میں راہ محبت میں چلنے والے طالب کو یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ اللہ کے لئے اس کے مجاہدے مقبول ہوں گے اور اس کے لئے بالآخر اللہ تک رسائی کی صورت پیدا کر دی جائے گی۔

اللہ کی محبت میں چلنے والے طالب کے حالات بڑے صبر آزما ہوتے ہیں، اس کی کیفیات میں ردوبدل کا ایک نہ ختم ہونے سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، وہ گرتا ہے، پھر اٹھتا ہے گرنے اور اٹھنے کا اس کا یہ عمل برسوں تک جاری رہتا ہے، اس کے دل کا اضطراب بھی ایسا ہوتا ہے جو تھمنے کا نام نہیں لیتا، اگرچہ اسے حلاوت بھی غیر معمولی حاصل ہوتی ہے، لیکن حلاوت کے بعد بے قراری کی جو حالت ہوتی ہے، وہ اسے ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ دراصل دنیا میں ہر شخص کو نفس پرستی اور مادیت پرستی کے حالات سے دوچار کر کے اسے زبردست ابتلا وآزمائش سے دوچار کیا گیا ہے، فرد کے ساتھ نفس کی قوتوں کی یلغار ہوتی ہے، جس سے اسے سابقہ درپیش ہوتا ہے، اسے خواہشات کی طوفانی لہروں سے گذرنا پڑتا ہے، ابتلا وآزمائش کے ان حالات سے گزرتے ہوئے وہ اللہ تک رسائی کے لئے کوشاں ہوتا ہے، لیکن نفس کی قوتیں اس کی جان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتی، ایک سال دو سال تو کچھ بھی نہیں، اللہ کی محبت کے رازدان فرد کو برسہا برس لگ جاتے ہیں، وہ حالتِ دلشکنی اور بے قراری سے نکلنے نہیں پاتا، قرآن کی یہ آیت ایسی ہے جو اسے حوصلہ دلاتی ہے کہ مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، اسے نفس کی دلدل سے نکال کر بالآخر اللہ تک اس کی رسائی کی صورت پیدا کر دی جائے گی، اور اسے کامیابی سے ہمکنار کر دیا جائے گا۔

وہ طالب سب سے زیادہ خوش نصیب ہے جو روزانہ ہر طرح کے حالات میں مجاہدوں سے کام لے کر راہ محبت میں چلتا رہتا ہے، راہ محبت کی مشکلات سے گھبرا کر فرار اختیار کرنا یہ جہاں بزدلی ہے وہاں عبدیت کے تقاضوں کے بھی منافی ہے، بندہ پیدا ہی عبادت کے لئے ہوا ہے، عبادت کا بڑا حصہ اللہ کے ذکر سے وابستہ ہے، نفس اور شیطان فرد کو یہ چقمہ دیتا ہے کہ راہ محبت میں روزانہ مرنا اور روزانہ زندہ ہونے کے حالات سے سابقہ درپیش ہوتا ہے، یہ ایک ماہ اور ایک سال کا مسئلہ ہوتا تو قابل برداشت تھا، لیکن یہ تو برسوں تک سلسلہ جاری رہے گا، اس لئے اس دردسر سے بچکر رسمی عبادت پر اکتفا کرنا کافی ہے، اس مغالطے کی وجہ سے اکثر طالب راہ فرار اختیار کر لیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تزکیہ نفس کے بحران سے دوچار ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنی خلفشار کا بھی شکار ہونے لگتے ہیں، اس لئے ہمت وحوصلے سے کام لینا چاہئے اور روحانی استاد سے اپنے رابطے کو مستحکم رکھنا چاہئے۔

موجودہ دور میں بعض بزرگوں کی طرف سے حسن ظن یا دعوتی جذبے کے زیر اثر غیر معمولی مجاہدوں سے پہلے ہی طالب کو خلافت دیدی جاتی ہے، اس طرح کی خلافت طالب

کے لئے سخت ابتلا و آزمائش اور مشکلات کا ذریعہ بن جاتی ہے، ایک اس اعتبار سے اس کا ایک نقصاندہ پہلو یہ ہوتا ہے کہ اس طرح کا طالب بے قراری کے انگاروں پر لیٹنے لگتا ہے، اس لئے کہ سلوک کی باقائدہ تکمیل سے پہلے قلب میں تغیر و تبدل کی حالت سے بچنا ممکن نہیں ہوتا، دوسرا بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس طرح کا فرد اپنے آپ کو کامل سمجھنے لگتا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی کامل ہونے کی نفسیات پختہ ہونے لگتی ہے، چنانچہ اس طرح کا فرد باطنی طور پر بے چینی کی حالت میں رہنے اور اپنی اصلاح سے بے نیاز ہونے کی وجہ سے آخر وقت تک کسی حقیقی بزرگ سے رجوع ہو کر اپنی اصلاح اور اپنے تزکیہ کی راہ پر گامزن نہیں ہوتا۔

اس آیت میں مجاہدوں سے راستہ دکھانے کا وعدہ فرمایا گیا ہے، مجاہدوں سے مراد جب تک اللہ کی محبت راسخ نہ ہو جائے، خیالات کا انتشار تھم نہ جائے، نفس کی قوت کا زور ٹوٹ نہ جائے، متوجہ الی اللہ ہونے کا ملکہ راسخ نہ ہو جائے، تب تک مجاہدوں سے کام لیتے رہنا ہے، اس کے بعد تھوڑا ذکر بھی کثیر میں ہی شمار ہو گا۔

محمد موسیٰ بھٹو

انسانی شخصیت میں کارفرما قوتیں

اور خوشگوار زندگی کی صورت

انسانی شخصیت میں مختلف قوتیں کارفرما ہیں، جس سے زندگی کا نظام رواں دواں ہے اور جس سے شخصیت کو کام کرنے کا موقعہ ملتا ہے، ان قوتوں میں نفس کی قوت، ذہن کی قوت، جنسی قوت، اور دل اور روح کی قوت شامل ہے۔ نفس خواہشات کا مرکز ہے، یہ صحیح خواہشات بھی ہو سکتی ہیں تو ناجائز خواہشات بھی۔ صحیح خواہشات کا حامل شخص نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کا صاحب ہوتا ہے، جب کہ بُری خواہشات کے غلبہ کا حامل شخص نفس امارہ کے تابع ہوتا ہے، جو اسے مسلسل بُرائیوں پر اکسانے کا موجب بنتا ہے۔

ذہن کی قوت کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے حالات و مسائل و معاملات کے سلسلے میں ضروری معلومات چاہتا ہے، یہ معلومات مختلف ذہنی سطح کے لوگوں کی مختلف نوعیت کی معلومات ہوتی ہیں، لیکن ذہن ہر شخص سے اپنی سطح کے مطابق معلومات کا طالب ہوتا ہے، ذہنی قوت سے ہی دنیا میں تلاش و تحقیق کا سفر جاری رہتا ہے۔

تیسری جنسی خواہشات کی قوت ہے، جس سے انسانی نسل کا تسلسل قائم رہتا ہے، اس خواہش کی عدم تسکین کی وجہ سے فرد بے قرار رہنے لگتا ہے، سبب یہ ہے کہ یہ فطرت میں ودیعت شدہ قوت ہے، اس سے انسانی رشتوں کا تسلسل قائم رہتا ہے۔

دل اور روح کی قوت محبوب حقیقی سے محبت کے جذبات سے بھری ہوئی ہے، جو بظاہر ہمیں نظر نہیں نظر آتی، لیکن عملاً ایسا ہی ہے، دل اور روح چاہتے ہیں کہ وہ حسن کی مرکز ہستی سے ایسی محبت کریں کہ یہ محبت دوسری ساری محبتوں پر غالب ہو جائے۔

یہ پاکیزہ محبت انسانی فطرت کا سب سے طاقتور داعیہ اور تقاضا ہے، یہی وہ محبت ہے جس سے انسانی شخصیت کا سارا توازن اور سارا حسن قائم ہے، لیکن جب دل اور روح کے اس داعیے کے مطابق اسے اس کی غذا نہیں ملتی تو انسانی شخصیت میں ٹوٹ پھوٹ، انتشار، خلفشار، بے یقینی، بے اعتمادی اور ڈپریشن کی حالت پیدا ہو جاتی ہے، اور فرد کا ذہن صحیح خطوط پر کام کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے اور نفس امارہ کی قوت فرد کی شخصیت پر غالب ہو کر اسے نافرمانی، سرکشی اور شیطنت کی راہ پر لگا دیتی ہے۔

صحیح طور پر دینی اعمال سرانجام دینے کے لئے بھی دل اور روح کے محبت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کوشاں ہونا ناگزیر ہے۔

حقیقی محبت سے محروم فرد کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ بظاہر تو اچھا خاصا انسان نظر آتا ہے، لیکن وہ دنیا کے چوراہے پر حیران و پریشان کھڑا نظر آتا ہے، جسے دنیا کے چھوٹے چھوٹے مسائل بھی سنگین نظر آنے لگتے ہیں، اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے بحرانوں سے مقابلہ کر کے ذہنی توازن کو کس طرح قائم رکھے۔

الغرض یہ کہ محبوب حقیقی سے محبت کا فلسفہ ایسا ہے، جو عملی فلسفہ ہے اور کامیاب، خوشگوار اور حسن سے بھرپور زندگی کا راز اسی سے وابستہ ہے۔

نیز محبت سے محرومی کی وجہ سے فرد کو محبوب اپنی ذات سے جدا کر کے، حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے، ایسا فرد کچھ دیر کے لئے خواہشات سے تسکین حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، لیکن یہ تسکین وقتی نوعیت کی ہوتی ہے، جب کہ فرد کا زیادہ تر وقت بے چینی کے انگاروں اور حالت اشتعال اور قابل رحم حالت میں گذرتا ہے۔

فطرت کے تقاضوں سے صرف نظر کرنے بلکہ فطرت سے جنگ کرنے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے، اس وقت اس اعتبار سے لگ بھگ پوری انسانیت فطرت سے حالت جنگ میں ہے، اس کی سزا وہ بھگت رہی ہے کہ ساری مادی خوشحالی کے باوجود وہ اضطراب، بے قراری، ایک دوسرے سے کشیدگی اور عدم ذہنی توازن کی حالت سے دوچار ہے۔

حل یہی ہے کہ اللہ سے والہانہ اور سچی محبت کی راہ اختیار کی جائے، جو ذکر و عبادت کے ذریعہ ہی پیدا ہو گی، اسی سے حسن کردار کی صلاحیت بھی پیدا ہو گی تو ساتھ ساتھ انسانیت کے شایانِ شان زندگی گزارنے کی استعداد بھی۔

یہ نکتہ واضح ہونا ضروری ہے کہ اللہ سے والہانہ اور سچی محبت پیدا ہو اور سکون اور سکینت حاصل نہ ہو اور بحرانوں سے نجات کی صورت پیدا نہ ہو، ایسا نہیں ہو سکتا، اللہ سے محبت کی خاصیت ہی یہ ہے کہ اس سے قرار حاصل ہوتا ہے اور زندگی پاکیزگی سے عبارت ہونے لگتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ محبت میں والہانہ پن ہو، اب سوال یہ ہے کہ یہ محبت کیسے پیدا ہو؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ اہل محبت سے دوستانہ تعلق مستحکم کیا جائے اور ان سے محبت کے اسرار و رموز سیکھے جائیں۔

خوشگوار اور حلاوت سے سرشار زندگی کے حصول کی صورت یہی ہے، دعا ہے کہ اللہ ہمیں اپنی سچی محبت کی زندگی عطا فرمائے۔ (آمین)

جدید انسان

مادیت کے عالمگیر اثرات کی زد میں

جدید انسان اس اعتبار سے قابل رحم ہے کہ اس کی شخصیت کا رخ منفی ہو گیا ہے اور اس کے عقل کا رشتہ دل اور روح سے منقطع ہو کر نفس پرستی کی قوتوں سے جڑ گیا ہے، جس کی وجہ سے وہ بہت سے مسائل کا شکار ہو گیا ہے اور فکری انتشار نے اس کا احاطہ کر لیا ہے، مادی طرز فکر کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ فرد مادیت کی دلدل میں پھنس جاتا ہے اور اس سے کسی بھی صورت میں نکل نہیں پاتا۔

علم کے تین ذرائع ہیں، وحی، دل اور عقل، جدید انسان نے وحی اور دل کو نظر انداز کر کے عقل ہی کو رہنمائی کا واحد ذریعہ سمجھکر اس کی اتباع شروع کی ہے، مغرب کی تقلید میں ہی ایسا ہوا ہے، جہاں عرصہ سے مادیت کی روح پھونکی جارہی تھی، اب جدید آلات کے ذریعہ یہ روح پھونکی جارہی ہے۔

عقل کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اگر وحی اور دل کے تابع نہ ہو تو اس پر جلد ہی نفس کی قوتیں غالب آجاتی ہیں، جو خواہشات نفس کو معبود کی صورت دینے کا ذریعہ بنتی ہیں، اس وقت دنیا پر چھائی ہوئی مادی تہذیب دراصل نفس کے یرغمال شدہ عقل ہی کی تشکیل دی ہوئی ہے، اس طرح کی مادی تہذیب انسانی شخصیت کی اصلیت یعنی دل اور روح کو نظر انداز کر کے ان کے تقاضوں سے انکار پر مبنی ہے، جس کی وجہ سے عقل کو نور کے وہ اجزاء نہیں مل پاتے، جو دل اور روح کے ذریعہ محبوب حقیقی سے محبت کے ذریعہ اسے ملنے چاہئے، چنانچہ عقلِ محض سے وجود میں آنے والی مادی تہذیب میں ذہنی، نفسیاتی اور روحانی بیماریاں عام ہوتی ہیں، احساس بے گانگی اور احساس تنہائی شدید بیماری کی صورت اختیار کرنے لگتا ہے، انسان مسائل ومشکلات میں اس طرح گھر جاتا ہے کہ وہ نیم پاگل کی سی حالت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس تہذیب میں گھر ولی اور خاندانی نظام مفلوج ہو جاتا ہے، افراد ایک دوسرے کے دکھ درد و غم میں شرکت کے ذریعہ ان کے غم کو کم کرنے میں حصہ دار نہیں بنتے، فرد بیمار ہوتا ہے، حتیٰ کہ وہ مر جاتا ہے، لیکن خونی رشتہ دار بھی اس کی تیمار داری کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، سبب یہ ہے کہ اس معاشرے میں خود پرست اور نفس پرست قوتوں کا راج ہوتا ہے، نفس پرست قوتوں کا یہ راج عقل، عقلیت، عقلی علوم اور مادی علوم کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

ایسی عقلیت کس کام کی، جو انسان کو نہ تو قلبی، ذہنی اور روحانی سکون دے سکے اور نہ ہی دوسرے انسان کے غم میں شریک ہو سکے، جو خونی رشتوں کے تقدس کو آخری حد تک پامال کرے۔

ہمارا معاشرہ اور معاشرے کا جدید انسان مغرب کی تقلید میں تیز رفتاری سے اسی راہ پر گامزن ہے، اس کی طرز فکر، طرز حیات اور مقصودِ حیات میں مغرب کی خود غرضانہ تہذیب کے مظاہر شامل ہو گئے ہیں، جو بڑی المناک بات ہے، ہمارا ایک دور تھا کہ ہم اپنی پاکیزہ تہذیب کے ذریعہ انسانیت کو متاثر کر رہے تھے، اب حالت یہ ہے کہ ہماری نسلوں کی نسلیں مادی تہذیب سے مسحور ہوتی جارہی ہیں۔

اپنے روحانی کلچر سے محرومی کا یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ فرد باطنی طور پر خالی ہوتا ہے، وہ عقل کو الفاظ کی صورت میں زیادہ سے زیادہ معلومات دیتا رہتا ہے، وہ الفاظ کی جادو گری اور طلسماتی چیزوں ہی کو حقیقی علم سمجھنے لگتا ہے، لیکن اس علم سے شخصیت کھوکھلی ہو جاتی ہے اور دل اور روح میں ماتم کی سی حالت برپا ہونے لگتی ہے۔

جدید مادی تہذیب میں بعض اچھی چیزیں بھی موجود ہیں، جن میں بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ، رائے کی آزادی، ملازمت کی سہولت، روزگار کی ضمانت، عدلیہ کی آزادی وغیرہ شامل ہیں، لیکن خاندانی اور گھریلو زندگی کی پامالی اور روح کی ویرانی کی قیمت پر یہ چیزیں، کتنا خسارہ کا سودہ ہے۔

موجودہ دور الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے، جس نے سارے فاصلے ختم کر کے انسان کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ ہماری نوجوان نسل جو روحانی، وجدانی اور ذہنی طور پر خالی ہے اور اپنی تہذیب سے ناآشنا بھی۔ وہ تیزی سے جدید تہذیب کی سحر کاریوں کا شکار ہوتی جارہی ہے، اس کو بچانے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی، اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس کی بہتر صورت پیدا فرمائے۔

شاہنواز فاروقی

کیا جدید سائنسی دور نے توہمات کا خاتمہ کر دیا؟

مسلمانوں کی گزشتہ دو سو سال کی تاریخ کا اہم ترین سوال یہ ہے کہ مغرب کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دو سو سال گزرنے کے باوجود مغرب کے سلسلے میں اپنے رد عمل کو دو اور دو چار کی طرح متعین نہیں کر سکے ہیں۔

مغرب کے سلسلے میں ہمارے معاشرے میں تین رویے پائے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ سیکولر اور لبرل عناصر کا ہے، جو مغرب کو 'حق' سمجھتا ہے اور اسے مغرب کی کامل پیروی ہی میں اپنی اور اپنے معاشرے کی 'نجات' نظر آتی ہے۔

مغرب کے سلسلے میں ہمارے ردِ عمل کی دوسری صورت یہ ہے کہ ایک بڑا طبقہ مغرب کو حیرت اور ہیبت سے دیکھتا ہے۔

یہ طبقہ شعوری یا لاشعوری طور پر مغرب سے اتنا مرعوب ہے کہ اسلام اور مغرب کا ملغوبہ تیار کرنے میں لگا رہتا ہے، حالاں کہ اسلام حق ہے اور مغرب باطل۔ چناں چہ ان کا کوئی ملغوبہ تیار ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے مذہبی اعتبار سے سب سے زیادہ افسوس ناک رویہ انہی لوگوں کا ہے.

تیسرا اور ایک بہت چھوٹا سا طبقہ مغرب کو مکمل طور پر مسترد کرتا ہے۔

آیئے اس دوسری قسم کے طبقے کی غلط فہمیاں دور کرتے ہیں. ان کی کچھ علمی غلطیاں اور دعوے یہ ہیں:

- انبیاء کی دعوت کی قبولیت میں رکاوٹ بننے والا ایک بڑا سبب 'توہم پرستی' تھا، مگر توہمات کا یہ دور اب قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔
- آج کا انسان 'سائنٹفک عہد' کا انسان ہے۔

- انسان پر انسان کی براہِ راست خدائی ماضی کی بات بن چکی ہے۔ اور باپ دادا کی اندھی تقلید بھی اب ختم ہو گئی ہے۔
- آج کا انسان مکمل آزاد ہے. آجکل عقائد کی تبدیلی کے معاملے میں بھی ہر کوئی آزاد ہے۔
- عہدِ جدید میں خدا مخالف نظامِ زندگی ناکام ہو چکا ہے۔
- ان کا یہ دعویٰ ہے کہ 19ویں صدی میں سائنس انکارِ خدا کی علمبردار تھی، مگر آئن اسٹائن خدا کو ایک سائنسی صداقت تسلیم کرتا تھا، اور آج تخلیق کائنات کے جواز کے سلسلے میں سائنس ایک خدا کے وجود کی 'قائل' ہو گئی ہے۔ آج پوری انسانیت اعتراف حق کی اس منزل پر آگئی ہے، جس پر انبیا اس کو لانے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔
- قرآنی استدلال 'سائنٹفک' ہے اور جدید سائنٹفک ذہن کے بھی عین مطابق ہے.

کیا توہمات کا دور ختم ھو چکا ہے؟

ہمیں حیرت ہے کہ یہ دعوے کرنے والوں کو یہ بات معلوم نہیں کہ عہدِ جدید کے اپنے 'توہمات ہیں'۔ برطانیہ کے نو مسلم دانش ور ابو بکر سراج الدین، المعروف مارٹن لنگز اپنی کتاب Ancient Beliefs and Modern Superstitions میں لکھتے کہ "معتقدات تو قدیم ہی ہیں البتہ توہمات جدید عہد کی پیداوار ہیں۔"

مگر عہدِ جدید کے توہمات کیا ہیں؟ عہدِ جدید کا ایک توہم یہ ہے کہ 'مادہ خدا ہے' حالاں کہ اس کی کوئی سند اس کے پاس نہیں۔ عہد جدید میں ترقی، آزادی، اور مساوات کے نعرے اور تصورات بھی جدید عہد کے 'توہمات' میں شامل ہیں۔

عہدِ جدید نے توہم پرستی کا ایک پورا کارخانہ لگایا ہوا ہے۔ اس کارخانے کی کوئی مذہبی بنیاد نہیں۔

انسان پر انسان کی خدائی ختم ہو گئی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ آج کے عہد میں انسان پر انسان کی خدائی کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ ماضی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ پوری جدید مغربی تہذیب کا کلمہ یہ ہے 'لاالہ الانسان' (نہیں ہے کوئی الہ سوائے انسان کے)۔

جمہوریت انسان پر انسان کی خدائی کا اظہار نہیں تو اور کیا ہے؟ ماضی میں 'اقلیت' انسان پر انسان کی خدائی کی مظہر تھی اور عہدِ حاضر میں 'اکثریت' یہ کام کر رہی ہے۔

باپ دادا کی اندھی تقلید بھی ختم ہو گئی ہے؟

ایسی بات کرنے والے خدا کا خوف کریں۔ مغرب جتنا نسل پرست ایک ہزار سال پہلے تھا، اتنا ہی آج بھی ہے۔ اِسے سفید فاموں کی برتری کا جتنا یقین بارہ سو سال پہلے تھا، اتنا ہی آج بھی ہے۔ وہ غیر سفید فاموں سے جتنی نفرت پانچ سو سال پہلے کرتا تھا، اتنی ہی آج بھی کرتا ہے۔

صلیبی جنگیں ایک ہزار سال پرانی بات ہیں، مگر مغرب آج بھی مسلمانوں کے خلاف صلیبی جوش و جذبے سے کام کر رہا ہے۔ صلیبیوں نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی جتنی توہین کی تھی، جدید مغرب اتنی ہی توہین آج بھی کر رہا ہے۔

کچھ لوگوں نے کہا کہ 'مغرب صلیبی جنگوں کا احیاء چاہتا ہے۔' یہ بھی ایک غلط تجزیہ ہے۔ دراصل مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ کبھی ترک ہی نہیں کی۔ مختلف ادوار میں اس جنگ کے عنوانات بدلے ہیں، جنگ مسلسل جاری ہے۔

جدید عہد میں عقائد کی تبدیلی پر معاشرتی جبر کم ہوا ہے؟

یہ بھی اس طبقے کی خوش فہمی اور جدید عہد سے مرعوبیت کی ایک مثال ہے۔ مغرب میں اسلام قبول کرنے والوں کی اکثریت بتاتی ہے کہ اسلام لاتے ہی ان کے والدین اور خاندان نے انہیں نکال دیا، دشمنی کر لی یا قطع تعلق کر لیا۔

مغرب کا ایک بڑا طبقہ سمجھتا ہے کہ اسلام قبول کرنے سے وہ ایک 'ترقی یافتہ' تہذیب سے نکل کر ایک 'پسماندہ' تہذیب کا حصہ بن جائے گا، اس لئے یہ بات اسے قبول نہیں۔ یہ معاشرتی اور تہذیبی جبر کی ایک بہت بڑی اور ہولناک مثال ہے۔

انکارِ خدا پر مبنی نظامِ زندگی عبرت ناک ناکامی سے دوچار ہو چکا ہے؟

نہ جانے کیوں اس کے لئے سوویت یونین کی مثال دی جاتی ہے. دیکھا جائے تو اس معاملے میں جہاں بے خدا سوویت یونین ناکام ہوا ہے، وہیں اس سے کئی ہزار گنا بڑا ماڈل بن کر بے خدا چین سامنے آیا ہے۔

بلاشبہ مغرب کی جمہوریت اور لبرل ازم بھی بحران کا شکار ہے، مگر اس کی ناکامی کی صورت میں ان کا کوئی نمائندہ یہ کہتا نظر نہیں آتا کہ اب ہمیں 'خدا مرکز' زندگی کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔

مغرب کے ممتاز دانشور، ایلون ٹوفلر نے اپنی تصنیف Future Shock میں لکھا ہے کہ "مغربی تہذیب کا حادثے سے دوچار ہونا یقینی ہے، مگر ہمیں اس حادثے سے بچنے کے لیے مذہب کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔"

کیا جدید سائنس خدا کے وجود کی قائل ہے؟

جدید سائنس کے بارے میں بنیادی بات یہ ہے کہ انیسویں صدی میں بھی ایک بے خدا علم تھی، اور آج 21 ویں صدی میں بھی ایک بے خدا علم ہے۔ بعض سائنس دان انفرادی حیثیت میں خدا کو مانتے ہیں، مگر 'سائنٹفک کمیونٹی' میں ان کی حیثیت وہی ہے جو بھارت میں 'شودروں' کی ہے۔

جہاں تک آئن اسٹائن کا تعلق ہے تو وہ نہ کسی Organized Religion کو مانتا تھا نہ کسی ایسے خدا پر ایمان رکھتا تھا جس پر ایمان لانے کی تلقین تمام مذاہب کرتے ہیں۔

وہ زیادہ سے زیادہ ایک 'ان دیکھی قوت' کو مانتا تھا. اس کے اس 'ایمان' کا اس کے سائنسی نظریات پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس نے کبھی نہیں کہا کہ اب ہمیں زندگی اور کائنات کو ایک خدا کی موجودگی کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔

جدید سائنس پر گفتگو کے لیے اس کی منہج کو سمجھنا ضروری ہے۔ جدید سائنس دو ستونوں پر کھڑی ہے، ایک ہے 'سائنسی مشاہدہ' اور دوسرا ہے 'سائنسی تجربہ'۔

سائنس کہتی ہے کہ وہ صرف اس چیز کے وجود کو تسلیم کرے گی جو سائنسی مشاہدے اور سائنسی تجربے سے ثابت ہو جائے۔

اتفاق سے مذہب کی کوئی بھی اہم چیز سائنس سے ثابت نہیں ہوتی۔ سائنس سے خدا کا وجود ثابت نہیں ہوتا، وحی اور نبوت کا برحق ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ آخرت کا ہونا ثابت نہیں ہوتا، جنت اور دوزخ ثابت نہیں ہوتے۔ فرشتوں اور جنات کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔

اس لیے کہ ان میں سے کچھ بھی 'مادی' نہیں۔ یہ سب چیزیں 'غیر مادی' ہیں اور سائنس کی دسترس سے باہر ہیں، مگر جدید سائنس اپنے علم اور طریقہ کار کی محدودیت یا limitation کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ وہ کہتی ہے بس وہی حق ہے جو سائنسی مشاہدے اور سائنسی تجربے سے ثابت ہے۔

قرآنی استدلال سائنٹفک ہے؟

قرآن کا ایک ایک نقطہ اٹل ہے۔ اس کے برعکس سائنسی نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ نیوٹن کی Mechanics تین سو سال تک 'حتمی حقیقت' کے طور پر پڑھائی جاتی رہی، مگر آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت نے نیوٹن کی Mechanics کو outdated بنا دیا، اور اب کوانٹم فزکس آئن اسٹائن کے نظریات پر سوالات اُٹھا رہی ہے۔

ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ قرآنی علم اور سائنسی علم میں کوئی باہمی تعلق نہیں۔ اسی طرح قرآنی استدلال اور سائنسی استدلال بھی ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

مفتی سید انور شاہ

غلط خبریں پھیلانے کی وبا!

دور حاضر میں جھوٹ کی نئی صورتوں کا نکل آنا

سوشل میڈیا نے جہاں رابطوں کو عام، تعلقات کے دائرے کو وسیع اور مسافت کے پیمانے کو بدل کر ہر شخص کو کہنے، لکھنے کا موقع فراہم کیا ہے، وہاں جھوٹ، الزام تراشی اور غلط خبریں پھیلانے کی وبا بھی انتہائی عام اور آسان ہو گئی ہے۔ اس سے قبل تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہونے والا واقعہ سوشل میڈیا کے ذریعے سیکنڈوں میں دوسری جگہ پہنچ جاتا ہے۔ خطرناک اور افسوسناک بات یہ ہے کہ سوشل میڈیا پر کسی بھی خبر یا افواہ کو تحقیق سے بھی پہلے پوری دنیا میں نشر کیا جاتا ہے۔ معلومات درست ہوں یا غلط، کوئی اس جھنجھٹ میں پڑتا ہی نہیں۔

اردو میں مشہور ضرب المثل ہے کہ ''جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے'' مگر اب سوشل میڈیا کے ذریعے اس کے ایسے پر نکل آئے ہیں، جس نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ہمارے ماحول میں زندگی کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں رہا: چھوٹے بھی، بڑے بھی، امیر بھی، فقیر بھی، رئیس بھی، مزدور بھی، خوش حال بھی، مفلس بھی، عالم بھی، جاہل بھی، نامور بھی، گمنام بھی، تعلق دار بھی، رعایا بھی، مجسٹریٹ بھی اور چپڑاسی بھی، مذہبی اور سیاسی اختلاف رکھنے والے بھی نیچے سے اوپر تک اس وبا کا شکار نظر آتے ہیں۔ کھلا جھوٹ تو ایسی چیز ہے جسے ہر شخص برا سمجھتا ہے، اس میں مسلمان اور کافر کی بھی قید نہیں، ان سے بھی اگر پوچھا جائے کہ جھوٹ بولنا کیسا ہے؟ تو یقیناً ان کا جواب بھی یہی ہوگا کہ بہت برا ہے، لہٰذا ایسے لوگوں کو جب کبھی اپنے کردار کی درستگی کا خیال آئے گا تو وہ جھوٹ سے بھی توبہ کر لیں گے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ دورِ حاضر میں جھوٹ کی بہت سی ایسی صورتیں تیزی سے وجود میں آگئی ہیں، جنہیں بہت سے لوگ جھوٹ سمجھتے ہی نہیں، لہٰذا انہیں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ ان سے کوئی غلط کام سرزد ہو رہا ہے، حالانکہ اسلام نے تو ان چور دروازوں کی بھی نشاندہی فرمائی ہے، جہاں سے انسان کی نفسانی خواہشات حیلے بہانے تلاش کر سکتی ہیں۔

نفس انسانی کی ایک فطرت یہ ہے کہ جس برائی کا الزام وہ براہِ راست اپنے سر نہیں لینا چاہتا، اسے کسی اور شخص کے کندھے پر رکھ کر انجام دینے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ مقصد بھی حاصل ہو جائے اور اپنے اوپر حرف بھی نہ آئے۔ آنحضرت ﷺ نے جھوٹ کے سلسلے میں انسان کی اس نفسانی کیفیت کو نہایت لطیف اور بلیغ پرائے میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''احیاء العلوم'' میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے: جھوٹ کی بدترین سواری یہ فقرہ ہے کہ ''لوگ یوں کہتے ہیں۔'' مطلب یہ ہے کہ جو لوگ براہ راست جھوٹ بولنے سے کتراتے ہیں، وہ بے بنیاد اور بے تحقیق باتیں لوگوں کے سر پر رکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ: ''لوگ تو یوں کہتے ہیں: ''لوگوں میں یہ بات مشہور ہے، ''''لوگوں کا کہنا تو یہ ہے۔'' یہ وہ جملے اور فقرے ہیں جو جھوٹ کے الزام سے بچنے کے لیے ایک ڈھال کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ جھوٹ جو اپنے پاؤں چل کر نہیں پھیل سکتا، اس قسم کے فقروں پر سوار ہو کر پھیل جاتا ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے اس فقرے کو ''جھوٹ کی سواری'' قرار دیا۔

یہ تو ایک لطیف اور استعاراتی پیرائے کا بیان تھا جو حقائق پر نگاہ رکھنے والوں کے لیے بڑا مؤثر اور دل میں اُتر جانے والا ہے، لیکن اسی بات کو آپ ﷺ نے ایک اور حدیث میں بالکل سادہ اور عام فہم الفاظ میں بھی ارشاد فرمایا جسے ہر شخص ہی سمجھ جائے، فرمایا: ''**كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ**'' ''انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنی بات ہی کافی ہے کہ وہ ہر وہ بات دوسروں کو سنانے لگے جو اس نے کہیں سے بھی سن لی ہو۔''

دونوں ارشادات کا منشا اور مقصد در حقیقت یہ بتانا ہے کہ ایک سچے مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ہر کچی پکی بات جو کہیں سے اُڑتی ہوئی ہاتھ آگئی، اسے آگے چلادے۔ یاد رکھیے! اس سے افواہیں جنم لیتی ہیں، جھوٹی باتیں معاشرے میں پھیلتی ہیں اور متضاد افواہوں کے گرد و غبار میں حقیقت کا چہرہ مسخ ہو کر رہ جاتا ہے۔

قرآن کریم نے بھی ایسی بے تحقیق افواہیں پھیلانے کی پر زور مذمت کی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں یہ منافقین کا وطیرہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے درمیان ایسی افواہیں پھیلاتے رہتے تھے، جن سے لوگوں میں بے چینی اور تشویش پیدا ہوتی تھی اور دشمنوں کو فائدہ پہنچتا تھا۔ قرآن کریم نے ان کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ۔ (سورۃ النساء: آیت ۸۳)

'' جب بھی امن یا خوف (جنگ) کے بارے میں انہیں کوئی بات پہنچتی ہے، وہ اسے پھیلانے میں لگ جاتے ہیں، اگر وہ اسے (پھیلانے) کے بجائے پیغمبر تک اور ذمہ دار لوگوں تک پہنچاتے تو وہ لوگ اس کی حقیقت جان لیتے جو اس کی کھود کر (تحقیق) کر سکتے ہیں۔''

قرآن و سنت کے ان ارشادات سے اسلام کا جو مجموعی مزاج سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ جب تک کسی بات کی مناسب تحقیق نہ ہو جائے، اس وقت تک اسے دوسروں کے سامنے بیان کرنا یا پھیلانا جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی بے تحقیق بات کو پورے وثوق اور یقین سے بیان کرے تب تو ظاہر ہے کہ وہ خلاف واقعہ اور غلط بیانی کے ذیل میں آتا ہے، لیکن اگر بالفرض وثوق کے ساتھ بیان کرنے کے بجائے ''لوگ کہتے ہیں'' جیسے فقرے کا پردہ اور آڑ لے کر بیان کرے، لیکن مقصد یہی ہے کہ سننے والے اسے سچ باور کر لیں، تب بھی مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں ایسا کرنا جائز نہیں۔

دراصل اسلام کا مقصد یہ ہے کہ ہر مسلمان معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد بن کر زندگی گزارے۔ اس کے منہ سے جو بات نکلے، وہ کھری اور سچی بات ہو اور وہ اپنے کسی قول و فعل سے غیر ذمہ داری کا ثبوت نہ دے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **''مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ''**۔ (سورہ ق: ۱۸)

(انسان جو بات بھی زبان سے نکالتا ہے، اسے محفوظ رکھنے کے لیے ایک نگہبان ہر وقت تیار ہے) مطلب یہ ہے کہ انسان یہ نہ سمجھے کہ جو بات وہ زبان سے نکال رہا ہے، وہ فضا میں تحلیل ہو کر ختم ہو جاتی ہے، بلکہ منہ سے نکلی ہوئی ہر بات کہیں ریکارڈ ہو رہی ہے، اور آخرت میں اس سارے ریکارڈ کا ہر شخص کو جواب دینا ہو گا۔

ان تمام تر اسلامی تعلیمات اور تاکیدات کے باوجود ہم اتنے بے قابو ہو چکے ہیں کہ ہمیں ذمہ داری کا ذرہ برابر احساس ہی نہ رہا۔ اور ہماری حالت یہ ہو گئی ہے کہ کہیں سے بھی کوئی اُڑتی ہوئی بات ہاتھ آگئی، اسے تحقیق کے بغیر دوسروں تک پھیلانے اور پہنچانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے، اور بے دھڑک ایک دوسرے کو اس طرح کی باتیں بھیج دیتے ہیں، جس کی وجہ سے فضا میں ہر وقت افواہوں کا ایک طوفان اور سیلاب برپا رہتا ہے۔

ابھی حال ہی میں سوشل میڈیا پر صحافیوں کی ایک فہرست جاری ہوئی اور واٹس اپ کے مختلف گروپوں میں نشر ہوتی رہی، بغیر ثبوت اور تحقیق کے ان صحافیوں کے متعلق اس میں کہا گیا تھا کہ: ''یہ سب قادیانی ہیں۔'' کئی حضرات سادگی میں اسے کارِ خیر سمجھ کر عام کرتے رہے، جبکہ ان ناموں میں کئی حضرات ایسے تھے جنہوں نے خود قادیانیت کے خلاف کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں سیاسی اختلاف رکھنے والے کارکنوں کی حالت ناقابل بیان ہے۔

کچھ دن پہلے سوشل میڈیا کے ایک نیٹ ورک میں ایک عالم کے متعلق یہ کہا گیا کہ انہوں نے پینتالیس لاکھ کی لسی نوش فرمائی ہے، کئی لوگ اسے سچ مچ سمجھ کر تبرا کر رہے تھے۔ یوں تو ہر قسم کی خبر میں احتیاط اور ذمہ داری کی ضرورت ہے، لیکن جس چیز کے نتیجے

میں کسی دوسرے پر کوئی الزام لگتا ہو، اس میں تو احتیاط کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے، کیونکہ اس سے کسی دوسرے انسان کی عزت و آبرو کا مسئلہ وابستہ ہے۔

اور بلا تحقیق افواہوں کی بنیاد پر کسی انسان کی عزت کو مجروح کرنا صرف جھوٹ ہی نہیں، بہتان بھی ہے، اور حقوق العباد میں سے ہونے کی وجہ سے زیادہ خطرناک اور سنگین جرم ہے، لیکن ہمارے موجودہ ماحول میں کسی شخص پر کوئی الزام عائد کرنا ایک کھیل بن کر رہ گیا ہے، جس میں کسی تحقیق اور ذمہ داری کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ بالخصوص اگر کسی شخص سے ذاتی، جماعتی یا سیاسی اختلاف ہو تو اس کی غیبت کرنا، اس پر بہتان باندھنا اور اسے طرح طرح سے بے آبرو کرنا بالکل جائز اور حلال سمجھ لیا گیا ہے۔

جھوٹ کی اس وبا نے غلط بیانی اور بہتان طرازی کی برائی دلوں سے نکال دی ہے، اور ہر غیر ذمہ داری شخص کو یہ حوصلہ ہو گیا ہے کہ وہ بے بنیاد سے بے بنیاد بات بے دھڑک معاشرے میں پھیلا دے۔

نیز اس صورت حال میں ایک انتہائی خطرناک بات یہ بھی ہے کہ غلط الزامات کے سیلاب میں حقیقی مجرموں کو فی الجملہ پناہ مل گئی ہے، یعنی جو لوگ واقعی خطاکار اور بدعنوان ہیں، انہیں بدنامی کا زیادہ خطرہ باقی نہیں، اس لیے وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر کوئی خبر ہماری بدعنوانی کے بارے میں اُڑی تو وہ اسی طرح مشکوک سمجھی جائے گی، جیسے اور بہت سی بے تحقیق باتوں کو سنجیدہ لوگ مشکوک سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، چنانچہ بدعنوان افراد آرام سے بدعنوانیوں میں ملوث رہتے ہیں اور بہت سے بے گناہوں کے دامن پر داغ لگ جاتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے معاشرے میں غیر ذمہ دارانہ باتیں بے حد پھیل گئی ہیں، لیکن مسئلہ اس صورت حال کی مذمت کرتے رہنے سے حل نہیں ہو سکتا، جب تک ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اسے تبدیل کرنے کا پختہ عزم نہ کرے۔ دوسروں پر نہ سہی، لیکن ہر شخص کو اپنے آپ پر مکمل اختیار حاصل ہے، جسے کام میں لائے بغیر یہ صورت حال تبدیل نہ ہو گی۔

(نوٹ: واضح رہے کہ اس مضمون میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی کتاب ذکر و فکر سے استفادہ کیا گیا ہے)۔

پروفیسر ڈاکٹر غلام سکینہ شیخ

اہل اللہ کے ایمان افروز واقعات

''سن رکھو کہ جو اللہ کے ولی ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔ (یعنی) وہ جو ایمان لائے اور پرہیز گار رہے، ان کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ کی باتیں بدلتی نہیں۔ یہ ہی تو بڑی کامیابی ہے۔ (سورۃ یونس: ۶۲تا۶۴)

ولی وہ ہے جسے دیکھنے سے اللہ یاد آجائے۔ جس کا وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں گذرے۔ جو ایمان اور تقویٰ کی صفت کا جامع ہو۔ جو خالص اللہ تعالیٰ کے لیئے محبت کرے۔ جسے نہ کوئی خوف ہو نہ کوئی۔

حضرت عبداللہ بن مبارک: آپ اعلیٰ درجے کے متقی تھے، ایک بار آپ ایک جگہ پر اترے۔ آپ کے پاس نہایت قیمتی گھوڑا تھا۔ آپ جب نماز میں مشغول ہوئے تو گھوڑا ایک کھیت میں جا کر چرنے لگا۔ جب آپ نے یہ حالت دیکھی تو گھوڑے کو وہیں چھوڑا، اس خیال سے کہ ناجائز چارہ اس نے کھایا ہے، چنانچہ آپ پیادہ روانہ ہوئے۔ ایک دفعہ آپ مرو سے ساٹم گئے تھے اور یہ سفر آپ نے ایک قلم دینے کے لیئے اختیار کیا جو آپ نے ایک شخص سے لیا تھا اور اس کو دینا بھول گئے تھے۔

ایک بار آپ جب حج سے فارغ ہوئے تو حرم شریف میں آپ پر چند لمحوں کے لئے غنودگی طاری ہوگئی، آپ نے خواب میں دیکھا کہ دو فرشتے آسمان سے اترے ہیں اور ایک فرشتے نے دوسرے سے پوچھا کہ اس سال حج پر کتنے لوگ آئیں ہیں، دوسرے نے جواب دیا، چھ لاکھ پھر اس نے کہا ''کتنے لوگوں کا حج قبول ہوا۔''؟ اس نے کہا، کسی کا بھی قبول نہیں ہوا، آپ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ سنا تو میرے دل میں اضطراب پیدا ہوا اور میں نے کہا، اس قدر لوگ جو اطراف واکناف سے صحراؤں اور بیابانوں کو طے کر کے آئے ہیں، ان کی ساری تکالیف و مصائب رائیگاں گئیں۔ پھر اس فرشتے نے کہا کہ دمشق میں ایک موچی ہے، اس کا نام علی ابن الموفق ہے، وہ حج کو نہیں آیا ہے، لیکن اس کا حج قبول ہوا ہے، اور حق تعالیٰ نے باقی سارے لوگوں کو اس کے طفیل بخش دیا۔ جب میں نے یہ سنا تو خواب سے بیدار ہوا اور خیال کیا کہ مجھے دمشق جا کر اس شخص کی زیارت کرنی چاہیئے۔ جب میں دمشق پہنچا تو اس کا گھر تلاش کیا اور مکان کے دروازے پر آواز دی۔ اندر سے ایک آدمی نکلا۔ میں نے اس سے اس کا نام دریافت کیا، اس نے کہا علی ابن الموفق، میں نے کہا کہ مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ اس نے کہا، ہاں کہو میں نے کہا، آپ کیا کام کرتے ہیں؟ اس نے جواب دیا، میں پارہ دوزی کرتا ہوں۔ پھر میں نے خواب کا سارا واقعہ اس سے بیان کیا۔ اس نے پوچھا آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا عبداللہ بن مبارک، اس نے نعرہ لگایا اور بیہوش ہو کر گر پڑا جب اسے ہوش آیا تو میں نے کہا کہ آپ مجھے اپنی حالت سے آگاہ فرمایئے انہوں نے کہا کہ مجھے تیس (۳۰) سالوں سے حج کی آرزو تھی۔ میں نے برسوں کی کوشش سے تین ہزار درھم جمع کیئے۔ اور اس سال حج کرنے کا ارادہ کیا، ایک دن میری بیوی مجھے کہنے لگی کہ، ہمسایہ کے گھر سے آج گوشت کی بو آرہی ہے۔ کچھ طعام لے کر آؤ، میں گیا تو ہمسایہ نے کہا کہ تین روز سے میرے بچوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ آج اتفاقاً میں نے ایک مردار گدھا دیکھا تو اس سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ لیا اور طعام تیار کیا، یہ کھانا تمہارے لیے حلال نہیں۔ جب میں نے یہ سنا تو میرا دل دکھ اور اذیت سے بھر گیا، میں نے تین ہزار درہم گھر سے اٹھا لایا اور اس کو دے دیئے کہ اس سے اپنے بچوں کا گزارہ کرو کہ میرا حج یہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کہ میرے خلوص نیت کو دیکھ کر بغیر ادائیگی مراسم حج اس نے میرے اس عمل کو قبولیت حج کا درجہ عطا فرمایا۔

مکہ شریف میں ایک دن حضرت ابراہیم ادھم، حضرت شقیق بلخی کے پاس تشریف رکھتے تھے، آپ نے فرمایا: اے ابراہیم! معاش کے بارے میں تم کیا کرتے ہو؟ فرمایا: اگر کوئی چیز مل جاتی ہے تو شکر کرتا ہوں، اگر نہیں ملتی تو صبر کرتا ہوں، آپ کہنے لگے، ہماری گلی

کے کتے بھی یہی کرتے ہیں، اگر انہیں کوئی چیز مل جاتی ہے تو اظہار شکر سے دُم ہلاتے ہیں اور اگر نہیں ملتی تو صبر کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم ادھم نے فرمایا: بھلا تم کیا کرتے ہو؟ آپ نے فرمایا: اگر ہمیں کوئی چیز مل جاتی ہے تو ایثار کرتے ہیں اور اگر نہیں ملتی تو صبر کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم ادھم اٹھے اور آپ کا سر چوم لیا۔

جب سات سو علما سے دریافت کیا گیا کہ عقلمند کون ہے، دولتمند کون ہے، دانا کون ہے، درویش کس کو کہتے ہیں اور بخیل کون ہوتا ہے، اب سب نے ایک ہی جواب دیا کہ: عقلمند وہ ہے جو دنیا کو دوست نہ رکھے، اور داناء وہ ہے، جسے دنیا فریب نہ دے سکے۔ اور دولتمند وہ ہے جو اللہ کی تقسیم پر راضی ہو اور درویش وہ ہے جس کے دل میں زیادہ کی طلب و حرص نہ ہو۔ اور بخیل وہ ہے جو حق تعالیٰ کے مال کا حق ادا نہ کرلے۔

حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ میں نے اخلاص ایک حجام سے سیکھا ہے۔ جب میں مکہ معظمہ میں تھا، ایک حجام ایک خواجہ کی حجامت بنا رہا تھا۔ میں نے اسے کہا: کیا آپ اللہ کے لئے میرے بال بناؤ گے؟ اس نے کہا ہاں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ ابھی تک اس خواجہ کی حجامت پوری نہیں ہوئی تھی کہ حجام نے اسے کہا کہ آپ اب اٹھ جائیں، کیونکہ اللہ کا نام درمیاں میں آگیا ہے۔ پھر مجھے بٹھایا، میرے سر کا بوسہ دیا اور میرے بال بنوائے، اس کے بعد مجھے ایک کاغذ دیا، اس میں رقم تھی۔ اور مجھ سے کہا: اسے اپنی ضرورت کے لئے خرچ کرنا۔ میں نے دل میں یہ سوچ لیا کہ جب مجھے کہیں سے رقم ملے گی تو اس کو دے دوں گا۔ کچھ دنوں کے بعد بصرہ کے لوگوں کی طرف سے مجھے اشرفیوں کی تھیلی ملی۔ میں اسے لے کر حجام کے پاس گیا اور تھیلی اسے دیدی تو اس نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ میں نے نیت کرلی تھی کہ جب میرے پاس رقم آئے گی تو میں آپ کو دیدوں گا۔ اس نے کہا، تجھے اللہ سے شرم نہیں آتی؟ تو نے مجھے کہا تھا کہ اللہ کے لئے میرے بال بنالو، اور اب یہ کیا لے آئے ہو؟ کیا یہ اس کا عیوض ہے؟ کیا تو نے کہیں دیکھا ہے کہ کوئی شخص اللہ کے نام پر کوئی کام کر کے اس کا عیوض طلب کرے؟؟

حضرت عبداللہ مسعود فرماتے ہیں، اللہ کے نزدیک ایک بڑا گناہ یہ ہے کہ ایک شخص نصیحت کے طور پر دوسرے سے کہے ''تو اللہ سے ڈر'' اور وہ اس کا جواب دے ''تو اپنے آپ کو سنبھال''۔

حضرت شیخ سعدی اپنے باپ کے ہمراہ سفر میں تھے۔ دورانِ سفر ایک رات اپنے باپ کے ہمراہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہے۔ تہجد کے وقت آپ نے نماز پڑھی، جب کہ قافلہ کے دوسرے افراد سو رہے تھے۔ تہجد کی نماز کے بعد آپ نے باپ سے کہا کہ یہ لوگ کیسے بے خبر سو رہے ہیں۔ کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھ لے۔ باپ نے کہا: جان پدر! اگر تم بھی سوئے رہتے تو اس سے بہتر تھا، بجائے اس کے کہ لوگوں کی غیبت کر رہے ہو۔

عمر بن عبدالعزیز، جن کو پانچویں خلیفے کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، مسند خلافت سے پہلے آپ قیمتی لباس، قیمتی خوشبو، قیمتی سواری رکھتے تھے، جب خلافت پر فائز ہوئے تو ساری رات روتے روتے کاٹی کہ داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی، کہ اللہ کو اتنے بڑے بوجھ کا حساب کیسے دوں گا۔ انہوں نے اپنی راحت کی زندگی کو مثالی سادگی میں بدل دیا۔ اپنا سارا سامان بیت المال میں جمع کروادیا۔ ان کی بیوی کے پاس قیمتی ہار تھا، اسے کہا کہ اگر تم اسے عزیز رکھتی ہے تو مجھے چھوڑ دے، اگر مجھے عزیز رکھتی ہو تو اسے بیت المال میں جمع کروادے۔ گھر میں کسی چیز کی اشد ضرورت ہوتی تھی تو بھی بیت المال سے لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگوں کی امانت تھی۔ حکومت کا کوئی کام ہوتا تو بیت المال سے قلم، چراغ، سیاہی اور کاغذ لیتے تھے اپنے ذاتی کام کے لئے اسے غلط سمجھتے تھے، کوئی مسافر آجاتا تھا تو اسے بیت المال سے گوشت روٹی کھلاتے تھے اور اس کے سامنے خود سوکھی روٹی پانی میں بگھو کے کھاتے تھے۔

اس کے کہنے سے بھی وہ بیت المال کی روٹی نہیں کھاتے تھے۔اور مسافر چلا جاتا تھا تو بیت المال کا چراغ بھی گل کر دیتے تھے۔

خلافت سے پہلے آپ لوگوں سے بہت تحفے لیتے تھے اور اور ان کو دیتے تھے، کیونکہ آپ بیت مالدار تھے، اور حدیث مبارکہ بھی ہے کہ تحفے تحائف سے محبت بڑھتی ہے، لیکن جب آپ نے اپنا سارا مال بیت المال میں جمع کرا دیا تو آپ نے کس کو کوئی قیمتی تحفہ نہیں دیا۔ اور کسی سے کوئی تحفہ نہیں لیا، کیونکہ آپ یہ حدیث مبارکہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ :

''سرکاری ملازم کو اپنے عہدہ کی بنا پر کوئی تحفہ نہیں لینا چاہئیے۔'' (صحیح بخاری)

آپ بہت بڑے عاشق رسول تھے۔ آخرت سے ڈرنے والے اور خوف خدا سے رونے والے تھے، ایسے عادل تھے کہ آپ کی خلافت میں آپ کے عدل وانصاف کو دیکھ کر بھیڑ اور بکری ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے تھے۔(سبحان اللہ)

خلیفہ الحکم بن خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کو اپنا محل بنوانا تھا، اتفاق سے جو زمین پسند کی گئی، وہ ایک غریب بیوہ کی تھی، اس پر اس کا کچا مکان بنا ہوا تھا۔ اس بیوہ کو کہا گیا کہ یہ زمین قیمت پر دیدے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اور خلیفے نے زبردستی وہاں محل بنوالیا۔ عورت قاضی کے پاس شکایت کے لئیے گئی۔ قاضی نے اسے تسلی دی کہ مناسب وقت پر تیرے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کروں گا۔ خلیفہ الحکم جب پہلی بار محل اور باغ دیکھنے گیا تو قاضی بھی وہاں ایک گدھا اور ایک خالی بوری لے گیا، خلیفے سے اجازت مانگی کہ یہاں سے ایک بوری مٹی لے لوں؟ خلیفے نے اجازت دے دی۔ جب بوری میں مٹی بھر لی تو خلیفے سے کہنے لگا کہ آپ اس بوری کو اٹھانے میں میری مدد فرمائیں، خلیفے نے جب بوری میں ہاتھ ڈالا تو وزن زیادہ ہونے کی وجہ سے میں بوری نہ اٹھا سکا، اس وقت قاضی نے کہا کہ محترم خلیفہ صاحب! جب آپ دنیا میں اتنا بوجھ نہیں اٹھا رہے ہیں تو قیامت کے دن جب ہم سب کا مالک انصاف کرنے کے لئے عرش پر جلوہ افروز ہوگا اور جس وقت وہ غریب بیوہ جس کی تو نے زمین زبردستی لے لی ہے، اللہ سے فریاد کرے گی اور انصاف کی طلبگار ہو گی تو، اس کی زمین کے بوجھ کو کس طرح اٹھا سکو گے۔

اس بات سے خلیفے کے دل میں اللہ کا خوف پیدا ہوا اور اس نے پورا محل سارے سامان سمیت اس بیوہ کو دے دیا۔

حضرت شعبہ مشہور محدث ہیں۔ بڑے عابد وزاہد اور عالم فاضل تھے۔ایک سائل ان کے پاس حاضر ہوا ان کے پاس انہیں دینے کے لئے گھر میں کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ اپنے مکان کی چھت سے ایک کڑی نکال کر اس کے حوالے کر دی کہ اس کو فروخت کر لینا اور معذرت بھی کی کہ اس وقت میرے پاس دینے کے لئیے اور کچھ نہیں۔

حضرت معاویہ نے حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس ایک لاکھ درھم بھیجے، آپ نے ان کو اسی وقت تقسیم کر دیا اور اس شام کے کھانے تک کا بھی ان کے پاس باقی نہ رہا۔

حضرت حاتم اصم فرماتے ہیں ''شیطان مجھ سے سوال کرتا ہے، تیرا کھانا کیا ہے، لباس کیا ہے، اور سکونت کہاں ہے؟ میں جواب دیتا ہوں کہ میری غذا موت ہے، میرا لباس کفن ہے اور میرا مسکن قبر ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی بادشاہوں کے تحفے قبول نہ فرماتے تھے۔ایک دفعہ خلیفہ وقت نے اشرفیوں کے تھیلیاں پیش کیں۔ آپ نے حسب معمول انکار فرمایا۔ خلیفہ نے اصرار کیا تو آپ نے ایک تھیلی دائیں ہاتھ اور دوسرا بائیں ہاتھ میں لے کر دونوں کو رگڑا تو اشرفیوں سے خون بہنے لگا آپ نے خلیفہ سے ارشاد فرمایا، تمہیں شرم نہیں آتی، بغداد کے لوگوں کا خون نچوڑتے ہو اور وہ مجھے پیش کرتے ہو خلیفے پر اتنا اثر ہوا کہ بے ہوش ہو گیا۔

یہ اللہ تعالیٰ کے نیک اور صالح بندے ہیں جن کو نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگیں ہونگے یہ ہی کامیاب لوگ ہیں، یہ ہی متقی و پرہیز گار لوگ ہیں، جو جنت کے حقدار ہیں جس کے نیچے نہریں بہتی رہتی ہیں:

مولانا سید محمد الحسنی

مسلمانوں کے کرنے کا کام

مسلمانوں کی ذمہ داری اس ملک میں نعروں، تمناؤں اور خواہشوں سے کہیں زیادہ بلند اور نازک ہے، اگر وہ اپنی زندگی سے اسلام کی اسی طرح غلط تصویر پیش کرتے رہے اور اسلام کا نام صرف اپنی مطلب براری کے لیے استعمال کرتے رہے، تو ان کو بڑی سے بڑی طاقت اور بڑی سے بڑی حکومت بھی نہیں بچا سکتی، اگر کوئی اسلامی ملک اس معاملہ میں کوتاہی کرتا ہے تو اس کو بھی تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا، اللہ تعالیٰ کا کسی خاص ملک اور قوم سے رشتہ نہیں، اس نے کسی قوم سے محض وطنی اور قومی بنیاد پر کامیابی اور سرفرازی کا کوئی وعدہ نہیں کیا، اس کا صاف اعلان ہے: **لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ۔** (سورۃ النساء، آیت:۱۲۳)

نہ تمہاری (خالی) امیدوں سے کچھ ہونے والا ہے نہ اہل کتاب کی، جو برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا۔

اس کی نصرت کا اگر وعدہ ہے تو صرف ایمان اور عمل صالح اور اپنی جد وجہد پر، اس کے لیے اگر ہم حالات میں تبدیلی کے آرزومند اور عزت و سلامتی کے خواہش مند ہیں تو ہمیں اسی سیدھے راستہ پر چلنا ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تجویز فرمایا ہے۔

وہ راستہ یہ ہے کہ ہم ذمہ دار اور شریف انسانوں اور سچے اور پکے مسلمانوں کی طرح اپنے ملک میں زندگی گزاریں اور شریعت و سنت کی راہ نمائی میں اپنی زندگی کی ان تمام خامیوں کو دور کریں، جو ایک مسلمان کی زندگی سے کوئی مطابقت نہیں رکھتیں، خاص طور پر ان

خامیوں اور کمزوریوں کو جن کی وجہ سے غیر مسلم، اسلام کی صاف، روشن اور پاکیزہ تعلیمات سے بد ظن اور متنفر ہو رہے ہیں۔

یہ خامیاں اور کمزوریاں وہ غلط اور غیر اسلامی رسم و رواج اور عادات ہیں جو ہمارے معاشرہ میں گھر کر چکی ہیں، بد خلقی و بد معاملگی، وعدہ خلافی و بد عہدی، اسراف و فضول خرچی، ظلم و بے انصافی اور رسوم و بدعات اس طرح کی چیزیں ہیں، جن سے نہ صرف ہمارے متعلق، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حضور ﷺ اور اسلام کے متعلق غیر مسلموں کے ذہنوں میں بہت غلط تصویر قائم ہوتی ہے۔

ہم میں سے ہر فرد کو (خواہ مرد ہو یا عورت) اپنی زندگی میں ایسی نمایاں اور کھلی ہوئی تبدیلی کرنی چاہیے، جس کو دیکھ کر ہر شخص یہ سمجھے کہ وہ ملت ابراہیمی کا صحیح معنوں میں فرزند اور حضور ﷺ کا سچا امتی ہے اور دوسروں سے کچھ مختلف قسم کا آدمی ہے، اس کے نفع و ضرر کے پیمانے اور کامیابی و ناکامی کے معیار جدا ہیں، اس کو دیکھنے والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں اور ان کے دل میں بھی اس کا شوق پیدا ہو کہ وہ اس نعمت میں شریک اور حصہ دار ہوں، ایک بے کار اور معطل قوم کے بجائے جو پیشین گوئیوں اور تمناؤں کی دنیا میں رہتی ہے۔ ہماری ملت کے ہر فرد کو فعال اور متحرک، کسی نہ کسی کار خیر میں مشغول و منہمک، خلق خدا کا ہم درد اور اپنے ملک کے لیے مفید و کار آمد ہونا چاہیے، اس کو اب باہمی نااتفاقیوں، اختلافات اور قیادت کی لڑائی سے ہمیشہ کے لیے فرصت پا کر جان و دل کے ساتھ اسلام کی دائمی و ابدی، عالم گیر و آفاقی اور انسانی و اخلاقی بنیاد پر ملت کی تعمیر نو میں لگ جانا چاہیے۔

جن ہاتھوں نے کسی زمانے میں بیت اللہ کی تعمیر کی تھی وہی ہاتھ آج پوری انسانیت کی تعمیر کر سکتے ہیں، لیکن یہ کام انہیں مسلمانوں کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے جو اپنی اس ذمہ داری اور اس فرض منصبی کو اچھی طرح پہچانتے ہوں، جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو سرفراز فرمایا ہے۔

ہم میں سے ہر شخص کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کی درستی ساری ملت کی درستی ہے، ملت کی درستی کا انتظار چھوڑ کر، اب ہمیں خود اپنی درستی میں لگ جانا چاہیے، یہی ملت کی اصلاح اور تعمیر و ترقی میں ہمارا صحیح حصہ اور نبوت محمدی کی بارگاہ میں ہمارا ادنیٰ خراج ہے۔

اسلامی سیرت و کردار کی صحیح ترجمانی اور اس کی عملی تفسیر اور زندہ تصویر خود اتنی پر کشش ہے کہ دو آج بھی دلوں کو موم کر سکتی اور دشمنوں کو دوست بنا سکتی ہے اور حالات میں ایسی انقلاب انگیز تبدیلی پیدا کر سکتی ہے کہ جس کا پورا تصور کرنا بھی اس وقت ہمارے لیے مشکل ہے۔

اس لیے پاکستان و ہندوستان اور ایران و توران کے قصوں کو چھوڑ کر مسلمانوں میں حرکت اور زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کیجیے، شکوہ و شکایت کا راستہ چھوڑیئے، اس خدا سے سچا تعلق اور اس کی مکمل اطاعت کا جذبہ پیدا کیجیے، جس کے قبضۂ قدرت میں سارے زمین و آسمان ہیں اور جس کا ایک اشارہ پوری دنیا کی قسمت بدل دینے کے لیے کافی ہے، جس کے ہاتھ میں عزت و اقبال کی کنجی ہے اور جس سے فائدہ اٹھانے کی یہی ایک شرط ہے، ایمان عمل صالح اور دین کے لیے بھرپور جد و جہد۔

انسان کی فطرت وہی ہے جو پہلے تھی، خلوص، محبت، خدمت، ہمدردی۔ پاکیزہ کردار اور اچھے اعمال آج بھی اس کی نگاہ میں اسی طرح قابل احترام ہیں، جس طرح پہلے تھے، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے بازار اور نیلام کی اس منڈی میں، جہاں اصول و کردار کوڑیوں

کے مول فروخت ہوتے ہیں، وہاں ان چیزوں کا اب کوئی خریدار نہیں، لیکن حق تو یہ ہے کہ سودا جتنا کم ہوتا ہے، اس کی اہمیت اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے، بیمار قوموں کی زندگی میں ایسے دور کبھی کبھی آتے رہتے ہیں، جب ان کے منھ کا مزہ بگڑ جاتا ہے اور یہ سارے حقائق ان کے لیے بے معنی اور بے قیمت ہو جاتے ہیں، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہمارا وطن ابھی اس منزل پر نہیں پہنچا ہے، یہاں محبت کی ایک صدا اور خلوص کی ایک ادا اب بھی دلوں کو تسخیر کرنے اور لوگوں کو اپنا اسیر بنانے کی طاقت رکھتی ہے، آج پوری انسانیت اس آب حیات کے ایک ایک گھونٹ کو ترس رہی ہے، اگر مسلمان آگے بڑھ کر اپنے قول و عمل، سیرت و کردار سے اپنے اس مکمل اور دلکش امن کا صحیح مظاہرہ کریں، جس میں یہ تمام انسانی اخلاقی خوبیاں جمع ہیں اور جس نے ہر دور میں انسانوں کی راہ نمائی اور بیماروں کی مسیحائی کی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ آج یہ نسخہ شفا ہماری حاں نوازی اور مسیحائی سے انکار کر دے۔

لیکن اس کے لیے مسلمانوں کو سب سے پہلے اپنے کو مخاطب کرنا ہوگا، اپنے مصائب کا ذمہ دار دوسروں کے بجائے خود اپنے کو قرار دینا ہوگا اور اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرنی ہوگی: **وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ۔** (سورۃ الحج، آیت: ۷۸)

ترجمہ: اللہ کے راستہ میں اس طرح بھرپور کوشش کرو جیسا کوشش کرنے کا حق ہے، اس نے تمہارا انتخاب فرمایا اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں کی۔''

یعنی ملت کی صلاح و فلاح اور حالات میں تبدیلی کی بھرپور کوشش میں اپنے طرف سے کوئی کوتاہی یا کمی نہ ہو، ہر مسلمان بلا استثنا اس کو اپنا اولین فریضہ سمجھے اور اپنے تمام تعلقات، مفادات اور تمام دلچسپیوں یا رواجوں کو اس کا تابع بنائے۔

آیت کے دوسرے جز **وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ۔** میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم دین کے اس کام کو پہاڑ نہ سمجھیں، ہم سے کسی ایسی بات کا مطالبہ نہیں کیا جارہا ہے جو ہماری طاقت سے باہر ہے، اللہ تعالیٰ نے دین میں کسی قسم کی تنگی، دشواری اور پیچیدگی نہیں رکھی ہے، آج خدا کے احکام کی بجاآوری اور شریعت و سنت پر عمل کرنے کو جتنا ناقابل عمل اور دشوار سمجھا جارہا ہے، وہ دراصل خود ساختہ اور ہمارے ذہن و دماغ کی پیداوار ہیں، اگر مردانہ وار ایک قدم بھی اٹھایا جائے گا تو راہ حق کی یہ ساری مشکلات ان شاءاللہ خود بہ خود دور ہوتی جائیں گی اور جن باتوں کو ہم بہت دشوار سمجھ رہے ہیں، وہ نہایت آسان نظر آئیں گی، لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب **وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ۔** کی پہلی شرط ہم پوری کر دیں گے۔

یعنی ہر مسلمان خواہ وہ کسی سطح و معیار پر ہو، اپنی زندگی کا ایسا نمونہ پیش کرے جس کو دیکھ کر لوگ اسلام کی خوبیوں اور اس کی امتیازی خصوصیتوں سے آگاہ ہو سکیں، اس کے ماحول میں اگر کوئی گندگی یا فساد ہے تو اسے دور کرنے کا ذمہ دار سب سے پہلے اپنے کو قرار دے، وہ بغیر کسی فخر و تکبر کے یہ سمجھے کہ ہر مسلمان اپنی جگہ پر روشنی کا ایک مینار ہے، اس کو خدا نے سب سے پہلے خود اپنے احتساب اور اس کے بعد دوسروں کے احتساب کے لیے پیدا کیا ہے۔

ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

اس پر ہمہ وقت یہ ذمہ داری ہے کہ شادی غمی میں، ملاقاتوں اور مجلسوں میں، دفتروں اور دکانوں میں، کسی جگہ یہ فراموش نہ کرے کہ اس کا اپنا بھی ایک فرض ہے، جو ملت کے اجتماعی فرض کی اساس اور بنیاد ہے، اس لیے کہ اگر وہ اس میں کوتاہی کرے گا تو اس کا نقصان خود اس کو اور اس کے ساتھ ساری ملت کو اٹھانا پڑے گا۔

اگر تاجر ہے، تو اس کو امانت دار اور ہمدرد تاجر ہونا چاہیے کہ یہ امانت اور سچائی اس کے دوسرے ہم پیشہ افراد میں عام ہو، ملازم ہے تو اس کو فرض شناس ایمان دار اور محنتی ہونا چاہیے، اگر مال دار ہے تو اس کو اپنے مال میں حلال و حرام کا اور حق ناحق کا پورا خیال رکھنا چاہیے اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کیے گئے ہیں ان کو پورا کرنا چاہیے، غرض ہم میں سے ہر فرد کو اس بات کی فکر ہونی چاہیے کہ وہ اپنے دائرہ عمل اور ماحول میں دین کی خدمت کس طرح کر سکتا ہے اور اس عظیم ذمہ داری سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے، جو امت محمدیہ کے ہر فرد پر عائد کی گئی ہے؟

ان آیات میں تین چیزوں کا خصوصیت سے ذکر ہے، نماز، زکوٰۃ اور اعتصام باللہ، یعنی اللہ کے ساتھ گہرا اور سچا تعلق، یہ تین باتیں گویا اس کے سفر کے لیے سنگ میل اور نشان راہ ہیں، جن کے بعد گمراہی یا ناکامی کا انشاءاللہ کوئی سوال نہیں۔

یہ پروگرام ہے جس کے نتیجہ سے بھی اللہ تعالیٰ نے ہم کو آگاہ کر دیا ہے، یعنی **هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ۔**

اگر ہم نے یہ کر لیا تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کارسازی اور بندہ نوازی، غیب سے ہماری نصرت، حفاظت اور عزت کا سامان کرے گی اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ مشکل کشا اور کارساز اور حامی و مددگار اور کون ہو سکتا ہے!!

محمد عرفان صدیقی

اسلام قبول کرنے والے کچھ جاپانیوں کے حالات

کچھ روز قبل میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ اس بات کی تحقیق کی جائے کہ جو جاپانی شہری دین اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے ہیں، وہ جاپان میں کتنے ترقی یافتہ ہیں یا انہوں نے اپنے شعبے میں کوئی ایسی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، جن سے جاپان میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا ہو؟ تھوڑی سی تحقیق کے بعد ۱۵/ ایسے اہم جاپانی مسلمانوں کے نام اور ان کی خدمات میرے سامنے تھیں، جو کسی بھی مسلمان کے لیے باعث فخر ہو سکتی ہیں۔ آیے آپ کو ایسے ۱۵ معروف جاپانی مسلمانوں سے متعارف کراتے ہیں جنہوں نے جاپانی معاشرے میں بطور جاپانی مسلمان اہم خدمات انجام دیں۔

۱۔ کینجی گوڈا ایک مشہور جاپانی صحافی اور فوٹو گرافر تھے، جو اسلام قبول کرنے کے بعد بین الاقوامی سطح پر انسانی حقوق اور امن کے سفیر بن گئے۔ انہوں نے مشرق وسطی میں جنگ زدہ علاقوں کی رپورٹنگ کی اور اسلام کے پیغام کو دنیا بھر میں عام کرنے کی کوشش کی۔

۲۔ نور محمد جن کا جاپانی نام نوریہ ایتو ہے، ایک مشہور اسلامی اسکالر اور مترجم ہیں۔ انہوں نے جاپانی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا اور اسلام کے بارے میں شعور بیدار کرنے کے لیے کئی کتابیں لکھیں۔ ان کا کام جاپانی معاشرے میں اسلام کو سمجھنے کا ایک ذریعہ بنا۔

۳۔ یوشی یوکی جاپان میں ایک معروف بزنس مین اور اسلامی فلاحی تنظیم کے بانی ہیں۔ انہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی زندگی کو فلاحی کاموں کے لیے وقف کر دیا اور جاپان میں ضرورتمند مسلمانوں کے لیے کئی منصوبے شروع کیے۔

۴۔ ریحان ماتسور جاپانی ٹیکنالوجی کے میدان کی ایک نمایاں شخصیت ہیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے اپنی کمپنی کے ذریعے اسلامی اخلاقیات پر مبنی کاروباری ماڈل اپنایا اور اپنی مصنوعات کو حلال معیار کے مطابق بنایا۔

۵۔ یاسر ناکامورا ایک جاپانی معمار ہیں، جنہوں نے کئی اسلامی طرز کے منصوبے بنائے ہیں۔ ان کی ڈیزائن کردہ مساجد اور اسلامی مراکز جاپان بھر میں مشہور ہیں۔ وہ اسلامی فن تعمیر کو جاپانی طرز تعمیر کے ساتھ ملانے میں مہارت رکھتے ہیں۔

۶۔ عائشہ کوبایاشی جاپان کی پہلی معروف مسلم خاتون صحافی ہیں۔ انہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد جاپانی خواتین میں اسلامی حجاب کے بارے میں شعور بیدار کرنے کا کام کیا اور کئی سیمینار منعقد کیے۔

۷۔ عثمان فوکودا ایک کامیاب جاپانی کاروباری شخصیت ہیں جو حلال فوڈ انڈسٹری میں پیش پیش ہیں۔ انہوں نے جاپان میں پہلا حلال فوڈ ریسٹورنٹ قائم کیا اور اسلامی کھانوں کو مقبول بنایا۔

۸۔ حسین تاکاہاشی جاپان میں اسلامی تعلیمات کے ایک مشہور استاد ہیں۔ وہ قرآن کی تعلیم دینے کے لیے مختلف کورسز کا انعقاد کرتے ہیں اور نوجوانوں میں اسلام کے بارے میں آگاہی پھیلانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔

۹۔ فاطمہ یاماموتو جاپان کی معروف سماجی کارکن ہیں۔ انہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد خواتین کے حقوق کے لیے کام شروع کیا اور جاپان میں مسلم خواتین کی نمائندگی کے لیے کئی پلیٹ فارمز بنائے۔

۱۰۔ عبداللہ کیکوچی جاپان کے معروف پروفیسر ہیں جو اسلام فلسفے اور ثقافت پر تحقیق کر رہے ہیں۔ ان کی تحریریں اور لیکچر جاپانی نوجوانوں میں اسلام کے بارے میں دلچسپی پیدا کر رہے ہیں۔

۱۱۔ آدم اوکاڈا جاپان میں ایک مشہور اسلامی اسپیکر اور موٹیویشنل کوچ ہیں۔ وہ اسلام کی تعلیمات کو جاپانی زبان میں آسان انداز میں پیش کرتے ہیں اور جاپانی نوجوانوں کو اسلام کی طرف مائل کرتے ہیں۔

۱۲۔ سمیع ناگانو آرٹ اور ثقافت میں اسلامی رنگ لانے کے لیے مشہور ہیں۔ وہ اسلامی خطاطی کے ماہر ہیں اور ان کا آرٹ جاپان اور دیگر ممالک میں نمائش کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔

۱۳۔ امینہ موری مسلمان خواتین کے لیے فیشن ڈیزائننگ کے میدان میں نمایاں ہیں۔ انہوں نے حجاب اور جاپانی روایتی لباس کو ملا کر ایک منفرد فیشن اسٹائل متعارف کرایا، جو جاپانی اور مسلم خواتین دونوں میں مقبول ہے۔

۱۴۔ یوسف شیزوکا ایک مشہور مترجم ہیں، جنہوں نے کئی اسلامی کتابوں کا جاپانی زبان میں ترجمہ کر کے اسلامی تعلیمات کو جاپانی معاشرے تک پہنچایا۔

۱۵۔ زینب تاکایا جاپان کی پہلی مسلم خاتون ڈاکٹر ہیں جنہوں نے حلال میڈیسن کی تحقیق میں مہارت حاصل کی۔ وہ اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن آف جاپان کی رکن ہیں۔

یہ ۱۵ جاپانی مسلمان اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام ایک جامع اور عالمی مذہب ہے جو کسی بھی قوم یا معاشرے کے افراد کو کامیابی کے مواقع فراہم کر سکتا ہے۔ جاپانی مسلمانوں کی یہ کامیابیاں نہ صرف ان کے ایمان اور محنت کا نتیجہ ہیں بلکہ یہ اسلام کے عالمی پیغام کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ مذہب اور پیشہ ورانہ کامیابی میں کوئی تضاد نہیں۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے تجدیدی کارنامے

اصلاح عقائد و دعوت الی القرآن

شاہ صاحب سے اللہ تعالیٰ نے تجدید واصلاح امت، دین کے فہم صحیح کے احیاء علوم نبوت کی نشر واشاعت اور اپنے عہد وملت کے فکر و عمل میں ایک نئی زندگی اور تازگی پیدا کرنے کا جو عظیم الشان کام لیا، اس کا دائرہ ایسا وسیع اور اس کے شعبوں میں اتنا تنوع پایا جاتا ہے، جس کی مثال معاصر ہی نہیں، دور ماضی کے علماء و مصنفین میں بھی کم نظر آتی ہے، اس کی وجہ (توفیق اور تقدیر الٰہی کے ماسوا) اس عہد کے حالات کا تقاضا بھی ہو سکتا ہے، جو شاہ صاحب کے حصہ میں آیا اور وہ جامعیت، علو ہمت اور مخصوص تعلیم و تربیت بھی شاہ صاحب کے خصائص میں سے ہے، اس سب کا نتیجہ تھا کہ شاہ صاحب نے علم و عمل کے اتنے میدانوں میں تجدیدی واصلاحی کارنامہ انجام دیا کہ ان کے سوانح نگار اور اسلام کی تاریخ دعوت وعزیمت پر قلم اٹھانے والے کے لیے، ان کا احاطہ اور ان سب کا تفصیلی تحلیلی جائزہ لینا دشوار ہو گیا ہے اور جو اس کا ارادہ کرے اس کی زبان بے اختیار فارسی کے اس مشہور شعر کے ساتھ شکوہ سنج ہو جاتی ہے۔

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین نو بہار تو دامان گلہ دارد

ہم ان کو اگر علیحدہ علیحدہ بیان کریں تو ان کے حسب ذیل عنوانات ہوں گے۔

۱۔ اصلاح عقائد و دعوت الی القرآن۔

۲۔ حدیث وسنت کی اشاعت و ترویج اور فقہ و حدیث میں تطبیق کی دعوت و سعی۔

۳۔ شریعت اسلامی کی مربوط و مدلل ترجمانی اور اسرار و مقاصد حدیث وسنت کی نقاب کشائی۔

۴۔ اسلام میں خلافت کے منصب کی تشریح، خلافت راشدہ کے خصائص اور اس کا اثبات اور رد رفض۔

۵۔ سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دور احتضار (انحطاط) میں شاہ صاحب کا مجاہدانہ و قائدانہ کردار۔

۶۔ امت کے مختلف طبقات کا احتساب اور ان کو دعوت اصلاح وانقلاب۔

۷۔ علمائے راسخین اور مردان کار کی تعلیم و تربیت، جو ان کے بعد اصلاح امت اور اشاعت دین کا کام جاری رکھیں۔

ہم سب سے پہلے اصلاح عقائد و دعوت الی القرآن کے عنوان کو لیتے ہیں کہ تجدید دین۔ واصلاح امت کا کام کسی دور اور کسی ملک میں بھی شروع کیا جائے تو اس کو اولیت حاصل ہو گی اور اس کے بغیر احیائے دین وملت کی جو کوشش بھی کی جائے گی وہ نقش بر آب اور عمارت بے اساس ہو گی، قرآن نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات و مکالمات سے اور مستند تاریخ نے نائبین انبیاء اور علمائے ربانیین کے طرز عمل اور ترتیب کار سے اسی حقیقت کو ثابت کیا ہے اور قیامت تک یہ ہر اس اصلاح و تجدید کا دستور العمل رہے گا، جس کا مزاج نبوی اور جس کا نظام قرآنی ہو گا۔

عقائد کی اہمیت

مصنف یہاں پر ایک سابقہ تحریر کا اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہے:

''اس دین کا سب سے پہلا امتیاز اور نمایاں شعار عقیدہ پر زور اور اصرار اور سب سے پہلے اس کا مسئلہ حل کر لینے کی تاکید ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین محمد ﷺ تک تمام انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام ایک معین عقیدہ کی (جو ان کو وحی کے ذریعہ

ملا تھا) دعوت دیتے اور اس کا مطالبہ کرتے رہے اور اس کے مقابلہ میں کسی مفاہمت یا دست برداری پر تیار نہ ہوئے، ان کے نزدیک بہت سے بہتر اخلاقی زندگی اور اعلیٰ سے اعلیٰ اسلامی کردار کا حامل، نیکی وصلاح، سلامت روی اور معقولیت کا زندہ پیکر اور مثالی مجسمہ، خواہ اس سے کسی بہتر حکومت کا قیام، کسی صالح معاشرہ کا وجود اور کسی مفید انقلاب کا ظہور ہوا ہو، اس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا، جب تک وہ اس عقیدہ کا ماننے والا نہ ہو، جس کو لے کر وہ آئے اور جس کی دعوت ان کی زندگی کا نصب العین ہے اور جب تک اس کی یہ ساری کوششیں اور کاوشیں صرف اس عقیدہ کی بنیاد پر نہ ہوں، یہی وہ حد فاصل، واضح اور روشن خط ہے جو انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت، اور قومی راہ نماؤں، سیاسی لیڈروں، انقلابیوں اور ہر اس شخص کے درمیان کھینچ دیا گیا ہے، جس کا سرچشمہ فکر و نظر انبیائے کرام کی تعلیمات اور ان کی سیرتوں کے بجائے کوئی اور ہو۔''

''حقیقت یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ جو علوم معارف انسانوں تک پہنچے ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ اور ضروری واہم علم خدا تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال کا علم اور اس مخصوص تعلق کا تعین ہے، جو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان ہونا چاہیے، یہ علم سب سے برتر و افضل علم ہے، اس لیے کہ اس پر انسانوں کی سعادت و فلاح دنیوی اور نجات اخروی موصوف ہے اور یہی عقائد و اعمال اور اخلاق و تمدن کی بنیاد ہے، اس کے ذریعہ انسان اپنی حقیقت سے واقف ہوتا، کائنات کی پہیلی بوجھتا اور زندگی کا راز معلوم کرتا ہے، اس سے اس عالم میں اپنی حیثیت کا تعین کرتا اور اس کی بنیاد پر اپنے ہم جنسوں سے اپنے تعلقات استوار کرتا ہے اور اپنے مسلک زندگی کے بارے میں فیصلہ اور پورے اعتماد و بصیرت اور وضاحت کے ساتھ اپنے مقاصد کا تعین کرتا ہے۔''

خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا اس امت کے ساتھ جو خصوصی رابطہ اور تائید و نصرت، رضا و محبت اور غلبہ و عزت کا جو مؤکد وعدہ ہے، وہ محض عقائد صحیحہ، ایمانی صفات و خصوصیات اور خاص طور پر خالص اور بے آمیز عقیدہ توحید کی بنا پر ہے، ارشاد ہے: **وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔** (سورۃ آل عمران:139)

ترجمہ: اور (دیکھو!) بے دل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا، مؤمن (صادق) ہو تو تم ہی غالب ہو گے۔

نیز کھلے لفظوں میں فرمایا گیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (سورۃ النور، آیت:۵۵)

ترجمہ: ''جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مستحکم و پائے دار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے (اور) میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بد کردار ہیں۔''

انبیاء کے نائبین برحق اور علمائے ربانی جو اللہ تعالیٰ کے دین کی فطرت اور اس کے مزاج سے واقف ہوتے ہیں، وہ اس کو کسی جگہ پر قائم کرنے کے لیے پہلے زمین کو پورے طور پر صاف و ہموار کرتے ہیں، وہ شرک اور جاہلیت کی جڑیں اور رگیں (خواہ وہ وثنیت قدیمہ کی یادگار ہوں یا قومی و مقامی اثرات کا نتیجہ) چن چن کر نکالتے اور ان کا ایک ایک بیج بن بن کر پھینکتے ہیں اور مٹی کو بالکل الٹ پلٹ دیتے ہیں، چاہے ان کو اس کام میں کتنی ہی دیر لگے اور کیسی ہی زحمت اٹھانی پڑے، وہ نتیجہ کے حصول میں کبھی عجلت اور بے صبری سے کام نہیں لیتے۔

''شرک'' (مختلف شکلوں میں) نوع انسانی کی سب سے خطرناک اور پرانی بیماری ہے، وہ اللہ کی غیرت اور اس کے غضب کو بھڑکانے کے ماسوا، بندوں کے روحانی، اخلاقی اور تمدنی ترقی کی راہ کا سب سے بڑا روڑا ہے، وہ انسان کی قوتوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے، اس کی صلاحیتوں کا خون کرتا ہے، قادر مطلق پر اس کے یقین، اس کی خود اعتمادی اور خود شناسی کا خاتمہ کر دیتا ہے اور سمیع و بصیر اور صاحب قدرت و علم، صاحب جود و عطا اور مغفرت و محبت والے خدا کی محفوظ مستحکم پناہ سے نکال کر اور اس کی لامحدود..... اور نہ ختم ہونے والے خزانوں کے فوائد سے محروم کر کے، کمزور و عاجز، فقیر و حقیر مخلوقات کے زیر سایہ پناہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے، جن کی جھولی میں کچھ نہیں۔''

(عقیدۂ توحید کی از سر نو تبلیغ و تشریح کی ضرورت)۔

مصنف نے ''تاریخ دعوت و عزیمت'' کی حصۂ دوم میں جو شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کے ساتھ مخصوص ہے، امام ابن تیمیہ کے زمانہ میں مشرکانہ عقائد و رسوم کے عنوان کے ذیل میں لکھا تھا:

''غیر مسلم و عجمی اقوام کے اختلاط، اسماعیلی و باطنی حکومت کے نفوذ و اثر، نیز جاہل و گم راہ صوفیوں کی تعلیم و عمل سے عام مسلمانوں میں مشرکانہ عقائد و رسوم کا رواج ہو چلا تھا، بہت سے مسلمان اپنے دینی پیشواؤں، مشائخ طریقت اور اولیاء و صالحین کے بارے میں اس طرح کے غالیانہ اور مشرکانہ خیالات اور عقیدہ رکھنے لگے تھے، جو یہود و نصاری حضرت عزیر و مسیح اور اپنے احبار و رہبان کے متعلق رکھتے تھے، بزرگان دین کے مزارات پر جو کچھ ہونے لگا تھا، وہ ان سب اعمال و رسوم کی ایک کامیاب نقل تھی، جو غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور مقدس شخصیتوں کی قبروں پر ہوتے تھے، اہل قبور سے صاف صاف استعانت و استغاثہ کا معاملہ ہونے لگا تھا، ان سے فریاد اور ان کی دہائی دینے سوال اور دعا کرنے کا رواج ہو گیا تھا، ان کی قبور پر بڑی بڑی مسجدیں تعمیر کرنے اور خود قبور کو سجدہ گاہ بنانے، ان پر سال بہ سال میلہ لگانے اور دور دور سے سفر کر کے وہاں آنے کا عام دستور تھا، کھلی قبر پرستی، خدا سے بے خوفی اور صاحب مزار سے خوف و خشیت، اللہ اور شعائر اللہ سے استہزا و استخفاف، بے باکی اور شوخ چشمی، بزرگوں کے ساتھ اعتقاد الوہیت کے درجہ تک مشاہدہ و مزارات کا حج اور بعض اوقات حج بیت اللہ پر اس کی ترجیح، کہیں کہیں مساجد کی ویرانی اور کسمپرسی اور مشاہدہ و مزارات کے رونق کا اہتمام، اس زمانہ کی جاہلانہ زندگی کے وہ خط و خال تھے، جن کے دیکھنے کے لیے بہت دور جانے اور بہت غور سے کام لینے کی ضرورت نہ تھی۔''

یہ مصر و شام و عراق جیسے ممالک کا حال تھا، جن کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے مبارک ہاتھوں فتح کیا تھا، جو مرکز اسلام، مہبط وحی اور مسکن رسول اللہ ﷺ سے بہت قریب اور مربوط تھے، جہاں کی زبان عربی تھی، جس میں قرآن مجید نازل ہوا، جہاں قرآن و حدیث کے درس کا سلسلہ ایک دن کے لیے موقوف نہیں ہوا اور جہاں علوم حدیث اور شرح حدیث پر عظیم ترین کتابیں لکھی گئی۔

اس کے مقابلہ میں ہندوستان (وہ بھی بارہویں صدی کے ہندوستان) کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے، جہاں اسلام ترکستان، ایران اور افغانستان کا چکر کاٹ کر ان لوگوں کے ذریعہ پہنچا، جو براہ راست فیضان نبوت سے مستفیض نہیں ہوئے تھے اور جن میں سے بہت سے اپنے نسلی اور قومی اثرات سے بالکلیہ آزاد نہیں ہو سکے تھے، پھر ہندوستان میں ہزاروں برس سے ایک ایسا مذہب، فلسفہ اور تہذیب حکم رانی کر رہے تھے جن کے رگ و پے میں وثنیت اور شرک جاری و ساری تھا اور جو ان آخری صدیوں میں وثنیت کا سب سے بڑا نمائندہ اور جاہلیت قدیم کا امین و محافظ رہ گیا تھا، یہاں برہمنیت اور دوسرے مشرکانہ ماحول سے منتقل ہو کر ہندوستان کی مسلمان آبادی کا ایک بڑا حصہ آغوش اسلام میں آیا تھا، پھر یہ بھی ذہن میں تازہ رہے کہ اس ملک کا (طویل ترمدت میں) قرآن و حدیث سے براہ راست وہ رابطہ نہیں رہا

تھا، جو ایران کے اثر سے علوم حکمت اور فلسفۂ یونان سے رہا، علوم دینیہ میں اگر اس کا علمی ودرسی طور پر رابطہ رہا تو فقہ، اصول فقہ، علم کلام سے، جن کا موضوع اور میدانِ بحث، مسائل و جزئیات اور اصول استنباط مسائل اور عقائد پر فلسفیانہ بحث سے ہے، عقائد کی اصلاح اور توحید کی ابتدائی دعوت نہیں۔

ہندوستان کے مذاہب، فلسفوں اور یہاں کے رسوم وعادات کا دسویں ہی صدی میں مسلم معاشرہ پر جو اثر پڑ چکا تھا، اس کا اندازہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس مکتوب سے لگایا جاسکتا ہے، جو انہوں نے اپنی ایک ارادت مند نیک خاتون کے نام لکھا ہے، جس سے مراسم شرک کی تعظیم، غیر اللہ سے استمداد اور طلب حوائج کے مشرکانہ عقیدہ، اہل کفر کے تہواروں کی تعظیم اور ان کے رسوم وعادات کی تقلید، بزرگوں کے لیے حیوانات کو نذر وذبح کرنے، پیروں اور بیبیوں کی نیت سے روزے رکھنے اور سیتلا سے خوف اور اس کی تعظیم (جس کو چیچک کی بیماری کی ذمہ دار دیوی سمجھا جاتا تھا) تک کی ہندوانہ ذہنیت اور توہم پرستی کا اندازہ ہوتا ہے، جو مسلمانوں کے گھروں میں داخل ہو چکی تھی، اس عہد پر اور سو برس گزر جانے کے بعد اور قرآن وحدیث سے براہ راست قوی اور عام رابطہ نہ پیدا ہونے کی وجہ سے عقائد میں جو خلل غیر اسلامی بلکہ منافی اسلام، عقائد واعمال کا جو اثر اچھے اچھے گھرانوں پر پڑا ہو، اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

شاہ صاحب کے زمانہ میں غیر مسلموں کے اثرات، قرآن وحدیث سے ناواقفیت اور دوری اور نتائج وخطرات اور عوام کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے آنکھیں بند کرکے موثر کوشش کے طویل خلا نے ہندوستان میں جو صورت حال پیدا کر دی تھی اور دین حنیفی کے (جس میں شرک کے کسی پرچھائیں کی گنجائش نہ تھی) متوازی جو نظام عقائد اور مسلم معاشرہ کی زندگی کے میدان میں جاہلیت کا جو سبزۂ خودرد پیدا ہو گیا تھا، اس کا کچھ اندازہ خود شاہ صاحب کی کتابوں کے بعض اقتباسات سے ہو سکتا ہے۔

''تفہیمات'' میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

''نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے تم مسلمان بھی آخر کار اپنے سے پہلے کی اُمتوں کے طریقے اختیار کر لوگے اور جہاں جہاں انہوں نے قدم رکھا ہے، وہاں ہم بھی قدم رکھوگے، حتیٰ کہ وہ اگر کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی ان کے پیچھے جاؤ گے۔ صحابہ نے پوچھا یارسول اللہ! پہلی اُمتوں سے آپ کی مراد یہود ونصاری ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا اور کون؟'' اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔

سچ فرمایا اللہ کے رسول ﷺ نے، ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ ضعیف الایمان مسلمان دیکھے ہیں، جنہوں نے صلحاء کو ارباب من دون اللہ بنا لیا ہے اور یہود ونصاری کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں، جو کلام شارع میں تحریف کرتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ نیک لوگ اللہ کے لیے ہیں اور گنہگار میرے لیے، یہ اسی قسم کی بات ہے جیسی یہودی کہتے تھے کہ: (**لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً**) (سورہ بقرہ، آیت: ۸۰) (ہم دوزخ میں نہ جائیں گے اور گئے بھی تو بس چند روز کے لیے) سچ پوچھو تو آج ہر گروہ میں دین کی تحریف پھیلی ہوئی ہے، صوفیہ کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال زبان زد ہیں، جو کتاب وسنت سے مطابقت نہیں رکھتے، خصوصاً توحید میں اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شرع کی انہیں بالکل پروا نہیں ہے۔''

اپنے شہرۂ آفاق رسالہ الفوز الکبیر میں تحریر فرماتے ہیں:

'' اگر تم کو (عہد جاہلیت کے) مشرکین کے عقائد واعمال کے اس بیان کے صحیح تسلیم کرنے میں کچھ توقف ہو، تو چاہیے کہ اس زمانے کے تحریف کرنے والوں کو، علی الخصوص جو دارالاسلام کے نواح میں رہتے ہیں، دیکھو کہ انہوں نے ولایت کی نسبت کیا خیال باندھ رکھا ہے، وہ لوگ باوجود یکہ اولیائے متقدمین کی ولایت کے معترف ہیں، مگر اس زمانے میں اولیاء کے وجود کو قطعا محال شمار کرتے ہیں، اور قبروں اور آستانوں پر پھرتے ہیں اور طرح طرح کے شرک میں مبتلا ہیں اور تحریف و تشبیہ نے ان کے اندر کس قدر رواج پکڑا ہے، موافق حدیث صحیح: لتتبعن سنن من کان قبلکم (تم اپنے پیشرو لوگوں کے نقش قدم پر چلوگے) ان آفات میں سے کوئی آفت بھی نہیں رہی، جس پر آج مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی جماعت کاربند اور اس کے مانند دیگر امور کی معتقد نہ ہو۔ ''**عافانا اللہ سبحانہ عن ذالک**''۔

امام ابن القیم الجوزیہ

گناہ سے جذبہ حمیت و غیرت کا فنا ہونا

گناہوں کی ایک سزا یہ ہے کہ انسان کے دل سے وہ غیرت فنا ہو جاتی ہے، جس سے دل کی حیات واصلاح وابستہ ہے۔ دل کی زندگی کے لیے غیرت وہی حکم رکھتی ہے، جو جسم کی زندگی کے لیے حرارت عریزیہ۔ جسم بغیر حرارت عریزیہ کے جس طرح زندہ نہیں رہ سکتا، دل بغیر غیرت کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ غیرت کی حرارت ہی دل کی خباثت وناپاکی، مذموم صفات اور ذلیل وخسیس اوصاف کو جلاتی ہے۔ اگ کی بھٹی سونے، چاندی اور لوہے کا زنگ ختم کر دیتی ہے۔ دنیا میں اسی طرح سب سے زیادہ شریف، بلند رتبہ، بلند حوصلہ، بلند مرتبہ، عالی قدر اور عالی ہمت شخص اپنے خواص اور بندگان خدا کے لیے انتہا درجے کی غیرت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی امت کے حق میں ساری دنیا سے زیادہ غیور تھے اور اللہ حق سبحانہ وتعالیٰ آنحضرت ﷺ سے بھی زیادہ غیور، جیسا کہ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''کیا سعد (بن عبادہ) کی غیرت پر تمہیں تعجب ہو رہا ہے؟ یقین کرو کہ میں ان سے زیادہ غیور اور اللہ تعالیٰ مجھ سے بھی زیادہ غیور ہے۔'' (صحیح بخاری، رقم: ۶۸۴۶)

اور صحیح بخاری میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ سورج گرہن کے موقع پر فرمایا: ''اے امت محمد ﷺ! اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی غیور نہیں کہ اس کا کوئی بندہ یا بندی بدکاری کرے۔'' (صحیح بخاری: رقم: ۱۰۴۴)

نیز مروی ہے: '' اللہ سے زیادہ کوئی غیور نہیں، اسی وجہ سے اس نے ظاہری اور باطنی فواحش کو حرام قرار دیا ہے۔ اللہ سے زیادہ کوئی معذرت کو پسند کرنے والا نہیں، اسی لیے اس نے اپنے پیغمبروں کو جنت کی بشارت اور دوزخ سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ اللہ سے زیادہ مدح

وتعریف کو پسند کرنے والا کوئی نہیں، اسی لیے اس نے خود اپنی تعریف فرمائی ہے۔'' (صحیح بخاری ۴۶۳۴، صحیح مسلم، رقم: ۲۷۶۰)

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے غیرت کو، سچ کی اصل قبائح، ذمائم اور جرائم سے کراہت وبغض ہے اور معذرت کو، جس کی اصل کمال عدل، کمال رحمت اور کمال احسان ہے، ایک جگہ جمع فرمادیا۔ حق سبحانہ وتعالیٰ انتہا درجے کا غیور ہے، لیکن پھر وہ اس بات کو محبوب رکھتا ہے کہ بندہ اس کی بارگاہ میں معذرت خواہ ہو کر آئے اور وہ اس کی معذرت قبول فرمائے، نیز جن اُمور سے غیرت وحمیت بھڑک اُٹھتی ہے، ان کے ارتکاب پر اللہ فوراً مواخذہ اور بازپرس نہیں فرماتا، تاکہ بندہ اس کی بارگاہ میں معذرت پیش کرے۔ اسی غرض سے اس نے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا اور بندوں کی طرف اپنی کتابیں بھیجیں، تاکہ پیغمبر انہیں بارگاہ خداوندی میں معذرت خواہی اور اس سے ڈرنے کی تلقین فرمائیں۔ یہ انعام واحسان اللہ کی انتہائی عظمت وجلالت اور غایت درجے کے احسان وکمال کی دلیل ہے۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ بافراط غیرت کے حامل افراد شدت غیرت میں بہت جلد مشتعل ہو جاتے ہیں اور فوراً عقوبت وسزا کا ہاتھ بڑھا دیتے ہیں۔ ملزم کو نہ معذرت کا موقع دیتے ہیں اور نہ اس کی معذرت قبول کرتے ہیں۔ بسا اوقات بات فی الواقع معذرت کی ہوتی ہے، نفس الامر میں وہاں جرم نہیں پایا جاتا اور بات عذر پذیری کی ہوتی ہے، لیکن شدت غیرت کی وجہ سے عذر قطعاً قبول نہیں کیا جاتا۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اندر غیرت کا مادہ سرے سے کم ہوتا ہے اور وہ معذرت قبول کرنے اور عذر پذیری ہی کو بہترین کام سمجھتے ہیں، تاآنکہ اس قسم کے لوگوں کے یہاں معذرتوں اور عذر پذیریوں کی راہیں بہت وسیع اور کشادہ ہو جاتی ہیں۔ ان امور کو بھی عذر سمجھا جاتا ہے جو فی الواقع عذر نہیں ہوا کرتے اور بے شمار انسانوں کو بلا عذر خواہی کے معذور قرار دے کر درگزر کر دیتے ہیں۔

بات بالکل واضح ہے کہ غیرت اور معذرت علی الاطلاق پسندیدہ نہیں ہے، بلکہ قابل تعریف وستائش یہ ہے کہ ہر دو اپنے اپنے درجے اور مرتبے میں نمایاں ہوں، افراط وتفریط کسی طرح بھی قابل ستائش نہیں ہے، چنانچہ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''غیرت کی بعض صورتیں اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور بعض ناپسند۔ ناپسندیدہ غیرت وہ ہے جو خواہ مخواہ شک وشبہ کی بنا پر کی جائے۔'' (مسند احمد، رقم: ۲۳۷۴۷)

حقیقت میں قابل ستائش یہ ہے کہ غیرت اور معذرت پذیری، دونوں ہم دوش وہم رکاب رہیں۔ غیرت کی جگہ غیرت سے کام لیا جائے اور عذر پذیری کی جگہ عذر پذیری سے۔ ہر وہ شخص جو ان دونوں کے مواقع اور ان کی رعایت کو اچھی طرح سمجھے، وہ مدح وثنا اور تعریف وستائش کا زیادہ مستحق ہے اور حق سبحانہ وتعالیٰ میں تمام صفات کمالیہ چونکہ بدرجۂ اتم موجود ومجتمع ہیں، اس لیے وہ سب سے زیادہ مستحق مدح وستائش ہے۔ وہ اس مدح کا مستحق وسزاوار ہے جو اس نے خود اپنے لیے کی ہے اور جس مدح وستائش کا وہ مستحق ہے، کوئی دوسرا اتنی مدح وستائش نہیں کر سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا کوئی غیور بندہ اگر اللہ تعالیٰ کی صفات کمالیہ میں سے کسی ایک صفت میں بھی اس کی موافقت کر لے تو یہ اس کی قیادت ورہبری کرتی ہے اور اس کی باگ پکڑ کر اُسے بارگاہ رب العالمین میں پہنچا دیتی ہے، پروردگار کی رحمت کے قریب لا کر اُسے کھڑا کر دیتی ہے اور بالآخر اسے اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین بندہ بنا دیتی ہے۔

گناہ کا اگر کوئی دوسرا اثر نہ بھی ہو تو یہی سزا بہت بڑی ہے کہ گناہگار انسان ان مقدس اور پاکیزہ صفات کی اضداد سے متصف ہو جاتا ہے۔ جب نوبت بایں جا رسید تو بندے کے لیے اس سے رستگاری اور نجات مشکل ہو جاتی ہے جس طرح طبعی اوصاف کو ترک کرنا مشکل اور متعذر ہوتا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ انسان میں جس قدر گناہوں کی شدت اور کثرت ہوتی چلی جائے گی، اسی قدر اس کے دل سے غیرت وحمیت کا جوہر کم ہوتا چلا جائے گا، پھر اُسے اپنے بارے میں غیرت آئے گی، نہ اپنے اہل وعیال کے بارے میں اور نہ عام لوگوں کے بارے میں۔ غیرت کا مادہ یکسر ختم ہو جائے گا۔ وہ کسی قباحت وگناہ کو قباحت وگناہ ہی نہیں سمجھے گا۔ انسان جب اس درجے تک پہنچ جاتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ وہ ہلاکت وتباہی کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس قسم کے اکثر لوگوں کا یہ حال ن ہو جاتا ہے کہ کسی قباحت وگناہ کو قباحت وگناہ ہی نہیں سمجھتے، بلکہ گناہوں اور ظلم وجور اور فسق وفجور کو ایک پسندیدہ مشغلہ بنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''دیوث'' کو خبیث ترین مخلوق کہا گیا ہے۔ غور کیجیے کہ غیرت کی کمی نے ''دیوث'' کو کس درجے تک پہنچا دیا! غیرت دل میں حرارت اور گرمی پیدا کرتی ہے۔ دل گرم ہو جائے تو سارے جسم میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی حرارت وگرمی کے بل پر وہ بُرائیوں اور فسق وفجور کی مدافعت کرتا ہے۔ دل میں غیرت کا ہونا ایسے ہی ہے جیسے انسان میں امراض کے لیے قوت مدافعت کا ہونا۔ غیرت انسان کے لیے وہی مقام رکھتی ہے جو بھینس اور بیل وغیرہ کے لیے سینگ کا مقام ہے۔ انھی سینگوں کے زور سے وہ اپنی اور اپنے بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر سینگ ٹوٹ جائیں تو پھر ہر دشمن ان پر حملہ آور ہونے لگتا ہے۔ (دوائے شافی، مترجم: محمد اسماعیل گودھروی، ص: ۱۶۰۔۱۶۴)

محمد صفوان قاضی

محاسبہ نفس کی اہمیت

قال النبیﷺ موتوا قبل ان تموتوا وحاسبو قبل ان تحاسبوا (کشف الخفاء: ۲:۴۲)

یہ ایک حدیث ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ مرنے سے پہلے مر جاؤ یعنی مرنے کی تیاری کر لو اور قیامت کے روز جو حساب وکتاب ہونا ہے اس سے پہلے محاسبہ کر لو اور اپنا جائزہ لے لو۔

علمائے کرام نے ان جملوں کے دو مطلب بیان کیے ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ حقیقی موت کے آنے سے پہلے تم اپنی وہ نفسانی خواہشات جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مخالف ہیں اور تمہارے دل میں گناہ کرنے کے اور ناجائز کام کرنے کے اور اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی کرنے کے جو دواعی اور تقاضے پیدا ہوتے رہتے ہیں ان کو کچل کر مٹا دو اور فنا کر دو۔

دوسرا مطلب علمائے کرام نے یہ بیان کیا کہ مرنے سے پہلے مرنے کا مراقبہ کرو۔ یعنی کبھی کبھی یہ سوچا کرو کہ ایک دن مجھے مرنا ہے اور اس دنیا سے خالی ہاتھ جانا ہے اور نہ میرے ساتھ میری جائیداد جائے گی اور نہ میری اولاد۔ بلکہ میں اکیلا خالی ہاتھ جاؤں گا..... اس کو ذرا سوچا کرو۔ گویا مراقبۂ موت کا حکم دیا جا رہا ہے۔

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کا انکار ممکن نہیں۔ آپ کو دنیا میں ایسے لوگ مل جائیں گے جو قرآن کریم کا انکار کرتے ہیں اور ایسے لوگ بھی مل جائیں گے جو انبیائے کرام کا انکار کرتے ہیں اور ایسے لوگ بھی بے شمار ہیں جو جزا، سزا اور جنت ودوزخ کا انکار کرتے ہیں اور آپ کو ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ملے گی جو خدا کا انکار کرتے ہیں تاہم ایسا کوئی نہیں ملے گا جو موت کا انکار کرتا ہے۔

یورپ نے صحت اور زندگی کی حفاظت کے بے شمار طریقے دریافت کیے ہیں اور وہ اپنی طبّی تحقیقات اور علاج معالجے کے جدید وسائل اور اسباب پر ناز کرتے ہیں۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود کیا ایک بھی سائنسدان یا ڈاکٹر ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ میں نے موت کا علاج دریافت کر لیا ہے؟ بلکہ بسا اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر کو جس مرض کے علاج میں مہارت ہوتی ہے اسی مرض کی وجہ سے اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ ماہر امراض قلب کا انتقال حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوتا ہے اور بلڈ پریشر کے معالج کی موت فشار خون کی وجہ سے ہو جاتی ہے۔ تو جب ثابت ہوا کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے اور اس سے کسی کو مفر نہیں تو ضروری ہے کہ موت اور مابعد الموت کی تیاری کی جائے، کیونکہ بحیثیت مسلمان کوئی ایسا نہیں جو بعث بعد الموت کا انکار کرتا ہو۔ پس جب موت بھی یقینی ہے اور بعث بعد الموت بھی، تو پھر موت کی تیاری بھی ناگزیر ہے، یہی دانشمندی ہے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ الکیس من دان نفسہ و عمل لما بعد الموت۔ (ترمذی شریف)

ترجمہ: عقلمند انسان وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو کرے اور مرنے کے بعد کے لیے تیاری کرے۔

آج کی دنیا میں عقل مند آدمی وہ سمجھا جاتا ہے جو مال کمانا خوب جانتا ہو۔ دولت کمانا، پیسے سے پیسے بنانا خوب جانتا ہو، دنیا کو بے وقوف بنانا خوب جانتا ہو۔ لیکن حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ عقلمند انسان وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو کرے اور نفس کی ہر خواہش کے پیچھے نہ چلے، بلکہ اس کو اللہ کی مرضی کے تابع بنائے اور مرنے کے بعد کے لیے تیاری کرے، ایسا شخص عقلمند ہے۔ اگر یہ کام نہیں کرتا تو وہ بیوقوف ہے کہ ساری عمر فضولیات میں گنوادی۔

جس جگہ ہمیشہ رہنا ہے وہاں کی کچھ تیاری نہ کی۔ موت کی تیاری کے لیے امام غزالی نے چار کام کرنے کو کہا ہے۔

(۱) صبح کے وقت نفس سے ''معاہدہ'':

فرماتے ہیں کہ جب تم صبح کو نیند سے بیدار ہو تو اپنے نفس سے ایک معاہدہ کر لو کہ آج کے دن صبح سے لے کر رات تک کوئی گناہ نہیں کروں گا اور میرے ذمے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد ہیں ان (کو ادا کرنے میں) میں کوتاہی نہ کرونگا، اگر اس معاہدہ کے خلاف ہو جائے تو اپنے نفس کو سزا دوں گا۔

(۲) پورے دن اپنے اعمال کا ''مراقبہ'':

اگر ہم ملازمت کرتے ہیں یا ہم تجارت کرتے ہیں اگر ہم دکان پر بیٹھتے ہیں تو ہر کام شروع کرنے سے پہلے سوچ لیا کریں کہ یہ کام میرے اس معاہدے کے خلاف تو نہیں ہے۔ تو اس کو مراقبہ کہتے ہیں۔

(۳) سونے سے پہلے ''محاسبہ'':

رات کو سونے سے پہلے سوچو کہ میں نے صبح کے وقت جو معاہدہ کیا تھا کون سا کام اس معاہدے کے مطابق کیا اور کون سا کام اس معاہدے کے خلاف کیا؟ اس طرح اپنے پورے دن کا جائزہ لو۔

(۴) آخر میں معاقبہ:

اگر نفس بہک جائے تو سونے سے پہلے ''معاقبہ'' یعنی اس کو سزا دینا ہے، یعنی اس معاہدہ کے مطابق کام کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اگر اس معاہدے کے خلاف کیا تو سونے سے پہلے اپنے نفس کو سزا دینی چاہیے یعنی اپنے نفس سے کہنا چاہیے کہ تم نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے لہٰذا اب آٹھ رکعت نفل پڑھنے چاہئیں۔ یعنی ان چار کاموں (معاہدہ، مراقبہ، محاسبہ اور معاقبہ) کی عادت ڈال لی جائے تو دن بھر کے معمولات فکر آخرت اور موت کی تیاری میں صرف ہوں گے۔

جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارا کوئی لمحہ بھی فکر آخرت سے غفلت کی نظر نہیں ہوگا۔

لہٰذا ضروری ہے کہ دنیا سے بقدر ضرورت تعلق رکھا جائے، اسے مقصد حیات اور مطمح نظر ہر گز نہ بنایا جائے بلکہ زندگی ایسی گزاری جائے جیسے آقا ﷺ کا ارشاد گرام ہے کہ :

کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔ (رواہ البخاری) کہ دنیا میں ایسے رہو جیسے کہ اجنبی رہتا ہے یا راہ چلتا مسافر، لیکن انسان کے طور طریقوں سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں ہمیشہ رہنے کے لیے آیا ہے۔

یاد رہے کہ زندگی بہت مختصر ہے دنیا میں انسان مختصر اور محدود مدت کے لیے آیا ہے۔ ذرا اندازہ لگائیں کہ آخرت کی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی کے مقابلے میں ساٹھ ستر سال زندگی کی حیثیت ہی کیا ہے؟ بہت کم ہیں جو اس حد سے تجاوز کرتے ہیں ورنہ عموماً امت محمدیہ کے لوگوں کی اوسط عمریں ساٹھ سے ستر سال کے درمیاں ہیں۔

ہمارے کچھ اہم معاملات
احادیث نبوی کی روشنی میں

مخلوق کا اللہ کا کنبہ ہونا

فرمایا، مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، جو مخلوق کے لئے اچھا ہے وہ اللہ کی نظر میں اچھا ہے۔

مخلوق کو اللہ کا کنبہ قرار دینا، مخلوق کے لئے جو بہتر ہو، اس کا اللہ کی نظر میں بہتر ہونا، یہ اسلام کی احسن تعلیمات کا حصہ ہے، اس حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام صرف اپنے مسلمان بھائی کے لئے ہی بہتر نہیں ہوتا، بلکہ اس کی شخصیت اللہ کے پورے کنبہ یعنی سب کے لئے بہتر، پاکیزہ اور ہر اعتبار سے مفید ہوتی ہے، وہ اپنے اخلاق و کردار سے سب کو متاثر کرتا ہے۔

آج مسلمان اگر اس حدیث شریف کا نمونہ بن جائے تو انسانیت کے لئے توحید اور اسلامیت کی راہ اختیار کرنا آسان ہو جائے۔

اسلام جس قسم کا انسان تیار کرنا چاہتا ہے، وہ پوری انسانیت کا غم اپنے سینے میں رکھنے والا انسان ہوتا ہے کہ کسی طرح انسانیت آخرت میں اللہ کے ابدی عتاب سے بچ جائے اور اس کی دنیاوی زندگی بھی ہر طرح کے خوف و حزن سے محفوظ ہو جائے۔

غیبت کی تعریف

فرمایا: غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرے جو اسے ناپسند ہو۔

غیبت ایسی چیز ہے، جس سے دوسرے کی دل آزاری ہوتی ہے اور اس کی شخصیت مجروح ہوتی ہے، غیبت چونکہ نفس کے آلہ کار زبان کو لذیذ لگتی ہے، اس لئے زبان عام طور پر غیبت کے بغیر رہ نہیں سکتی، ہر فرد میں عام طور پر خوبیاں بھی ہوتی ہیں تو خامیاں بھی، کوشش کرنی چاہئے کہ فرد کی خوبیاں پیش نظر ہوں، اس کی خامیوں کی طرف توجہ ہی نہ ہو، البتہ ایسا فرد جس سے معاملہ کرنا ہو یا ایسی شخصیت جس سے علم یا روحانیت کے اجزا حاصل کرنے ہوں، اس کے کمزور پہلوؤں کو جاننا ضروری ہے، تاکہ وہ اس کے کمزور اور نقصان دہ پہلوؤں سے بچ سکے، یہ چیز غیبت میں شمار نہ ہوگی۔

قناعت کے صاحب کا معزز ہونا

فرمایا: جس نے قناعت کی وہ معزز ہوا اور جس نے طمع کی وہ ذلیل ہوا۔

طمع دنیا کی حرص کا نتیجہ بھی ہے تو ساتھ ساتھ حرص میں اضافہ کا ذریعہ بھی۔ طمع سے دل ہر وقت للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگتا ہے کہ فلاں فلاں جگہ سے میری طمع کے جذبات کی تسکین ہوگی، جب تک طمع کی بنیاد (یعنی دنیا کی محبت) نہیں اکھڑے گی، تب تک فرد طمع کے مرض میں مبتلا ہوگا، طمع اگر کسی کو دھوکہ دینے سے پوری ہو یا لوٹ مار سے، فرد طمع کے لئے یہ ساری چیزیں اختیار کرے گا، طمع سے بچنے کا خصوصی اہتمام ضروری ہے۔

طمع سے فرد ذلیل بھی ہوتا ہے، تو دوسروں کا محتاج بھی، جب کہ قناعت سے معزز ہوتا ہے اور مستغنی بھی۔

بزرگی کی کچھ اہم علامتیں

فرمایا: بزرگی اس میں ہے کہ جو تجھ سے ٹوٹے تو اس سے جڑے، جو تجھے محروم رکھے تو اسے دے جو تجھ پر ظلم کرے تو اسے معاف کرے۔

بزرگی کی یہ علامتیں ایسی ہیں، جو بڑی بلند علامتیں ہیں، اللہ کے لئے جڑنا، اللہ کے لئے عطا کرنا، اللہ کے لئے معاف کرنا، یہ صفات و خصوصیات اگر پیدا ہو جائیں تو ایمان کی تکمیل ہو جائے، حقیقی اہل اللہ بزرگی کی ان خصوصیات وصفات کے حامل ہوتے ہیں، جو نفس کی قوتوں کو پامال کرتے ہوئے اس مقام پر فائز ہوتے ہیں، اسلامیت کا کمال یہ ہے کہ فرد اللہ کے لئے جڑنے اور اللہ کے لئے عطا کرنے اور اللہ کے لئے معاف کرنے کے مزاج کا حامل ہو جائے، اسلام جو معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے، وہ انہی صفات کے حامل افراد کا معاشرہ ہے، دور اول کے مسلمان ان صفات سے پوری طرح بہرہ ور تھے، اس کا نتیجہ تھا کہ دنیا، اسلام وایمان کی نعمت سے فیضیاب ہوئی۔ آج بھی اگر اللہ سے تعلق مستحکم ہو جائے تو یہ صفات کسی حد تک پیدا ہو سکتی ہیں۔

جب اللہ کی رضا کے مطابق زندگی گزارنا مقصود ہے، اور آخرت کی نجات اسی سے وابستہ ہے تو اللہ کے لئے جڑنے اور اللہ کے لئے نوازنے کی صفات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے، اور اس کے لئے جو بھی مجاہدے ممکن ہوں، وہ کرنے چاہئے۔

قلوب کی سرشت کی نوعیت

فرمایا: قلوب کی ایسی سرشت ہے کہ بھلائی کرنے والے سے محبت اور بُرائی کرنے والے سے نفرت کرتے ہیں۔

یہ حدیث شریف اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ ہر انسان کے دل کی ساخت اس طرح کی گئی ہے کہ اس میں بھلائی کرنے والے سے تعلق خاطر پیدا ہوتا ہے اور بُرائی کرنے والے سے دوری پیدا ہوتی ہے، یہ جذبہ ایسا ہے جو انسان کی فطرت کا حصہ ہے، دل فطرت کے اسی جذبہ کی ترجمان ہے، موجودہ دور میں اگرچہ نفس پرستی اور مادیت پرستی کی عمومی فضا کی وجہ سے یہ فطری داعیہ کسی حد تک دب گیا ہے، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ مادیت پرستی کی بڑی سی بڑی طوفانی لہر بھی دل میں موجود اس فطری جذبے کو ختم نہیں کر سکتی، بھلائی کرنے

والے کے ساتھ احسانمندی کی اداا اب بھی موجود ہے اور بُرائی کرنے والے سے نفرت کا جذبہ بھی۔

انسانیت کے اس فطری تقاضے سے استفادہ کرتے ہوئے اگر اسے اسلامی دعوت کے فروغ کے مقصد کے لئے استعمال کیا جائے تو اس کے بڑے فوائد و ثمرات ظاہر ہو سکتے ہیں، مثلاً دینداروں کی طرف سے سماجی بھلائی کے کام منظم طور پر کئے جائیں۔

کسی چیز کی محبت کا اندھا کر دینا

فرمایا: کسی چیز کی محبت (فرد کو) اندھا کر دیتی ہے۔

اس حدیث شریف میں ایک اہم حقیقت کی نشاندہی فرمائی گئی ہے کہ کسی چیز کی محبت سے فرد میں وہ عصبیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اس عصبیت سے بلند ہو کر دیکھنے کی صلاحیت سے قاصر ہو جاتا ہے، مثلاً اگر کسی شخصیت سے محبت ہو گئی، کسی جماعت سے محبت ہو گئی یا قومیت سے محبت کا جذبہ پیدا ہو گیا تو اس سے فرد عصبیت کی نذر ہو جاتا ہے اور یہ عصبیت اسے اندھا کر دیتی ہے، اور ہر وہ چیز جو اس کی اس عصبیت سے منافی ہو، وہ اسے غلط نظر آنے لگتی ہے اور حقائق کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی اس کی صلاحیت مفلوج ہو جاتی ہے، موجودہ دور میں دائراتی خولوں میں بند افراد میں اس عصبیت کے مظاہر عام ہیں، اس لئے محبت تو صرف اللہ اور اس کے دین سے ہونی چاہئے، اور اللہ کی خاطر ہونی چاہئے۔ یعنی دوسری محبتیں اللہ کی محبت کے تابع ہونی چاہئے۔

دوست کو چھان پھٹک کر منتخب کرنے کی اہمیت

فرمایا: دوست کو چھان پھٹک کر منتخب کرو اور اس سے چوکنے بھی رہو۔

دوستی کے انتخاب میں انتہائی احتیاط ضروری ہے، اس لئے کہ حدیث شریف کے مطابق فرد دوست کے دین پر ہوتا ہے، دوست میں اگر خرابیاں موجود ہوں گی، یا دین کے منافی عادتیں ہوں گی یا دنیا کی محبت ہو گی، یہ ساری چیزیں دوستی کے نتیجے میں فرد کی شخصیت میں از خود آنا شروع ہوں گی، دوستی کے ان اثرات سے زندگی بھر جان چھڑانا دشوار ہوتا ہے، حدیث کے یہ الفاظ بھی ایسے ہیں جو ہمیں احتیاط کرنے پر اکساتے ہیں کہ دوست کو چھان پھٹک کر منتخب کرنے کے بعد بھی ان سے چوکنے رہو، اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بزرگی کی شکل میں کسی کو دوست بنا لیا گیا اور اس کی صحبت و دوستی سے کچھ فوائد و ثمرات بھی ہوئے، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے دل میں تو دنیا کی محبت موجود ہے، اس لئے کہ ان کا طرز معاشرت مالداروں اور دنیا داروں جیسا ہے، جو ایک طرح سے دنیا کی محبت کی علامت ہے، جوں ہی چھان پھٹک سے یہ علم ہو گیا اور جس مرحلے پر بھی علم ہوا، اس مرحلے پر بلا تاخیر اس سے دوستی اور صحبت کا تعلق منقطع کر لو، ورنہ اس کی دوستی اور صحبت کے ماحول میں رہتے ہوئے دوسرے فوائد کتنے ہی حاصل ہوں، لیکن دل سے دنیا کی محبت نہیں نکل سکے گی، یہ روگ زندگی بھر موجود رہے گا، اس سے بڑھکر خسارہ کا سودہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

ایک دوسرے کو ہدیہ دینے کے بارے میں

فرمایا: ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو محبت پیدا ہو گی۔

اس حدیث شریف میں انسانی نفسیات کی بہت بہترین نشاندہی فرمائی گئی ہے کہ ہدیہ سے ایک دوسرے کی تکریم اور محبت پیدا ہوتی ہے، نیک افراد کی محبت سے دینی رشتہ بھی مستحکم ہوتا ہے تو ساتھ ساتھ دین پر چلنے میں آسانی بھی پیدا ہوتی ہے۔

ہدیہ سے قربت کا تعلق پیدا ہوتا ہے، لیکن ہدیہ کی عادت نہ ہو، کبھی کبھار ہو تو صحیح ہے عادت ہونے سے فرد کو انتظار ہونے لگتا ہے کہ فلاں صاحب آئیں گے وہ ہدیہ لائیں گے۔

بہر حال ہدیہ افراد کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ایک دوسرے سے دل کے تعلقات استوار کرنے میں غیر معمولی طور پر معاون ہے، اس کو رواج دینا چاہئے، ہماری

معاشرتی نوعیت کی کافی روایات ہیں جو مٹتی جارہی ہیں، جس کی وجہ سے ایک دوسرے سے محبت کے تعلقات ٹوٹتے جارہے ہیں۔

بندہ مومن کا شریف النفس ہونا

فرمایا: وہ شخص جو نرم دل ہے، شریف النفس ہے، غریب مزاج ہے، لوگوں سے قریب (یعنی ہر دلعزیز) ہے، اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ (مسند احمد)

حدیث شریف میں دوزخ سے بچنے والے بندہ مومن کی خصوصیات بیان فرمائی گئی ہیں کہ وہ نرم دل اور شریف النفس ہوتا ہے، سادہ مزاج ہوتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت ہوتی ہے، یہ محبت اس کے اخلاق، وکردار اور اس کی بے نفسی پر مبنی اداؤں کی وجہ سے ہوتی ہے، ان صفات کا حامل بندہ مؤمن دوزخ سے محفوظ ہے اور دوزخ کی آگ اس پر حرام ہے، مذکورہ صفات وخصوصیات ایسی ہیں، جو عبدیت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے نتیجے میں بندہ مؤمن میں پیدا ہوتی ہے، عبدیت کے تقاضوں کا مطلب ہے اللہ کے بندگی کے آداب بجا لاتے ہوئے اللہ کے لئے اپنے آپ کو مٹانا، ایسا فرد جہاں اللہ سے مخلصانہ وفاداری کے رشتے میں منسلک اور مستحکم ہوتا ہے، وہاں وہ اللہ کے بندوں کے لئے بھی شفیق اور کریم ہوتا ہے، اس کا دل نرم ہوتا ہے، وہ اتنا بے نفس ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت سے کسی کو اذیت اور نقصان پہنچنے کا خوف وخطر لاحق نہیں ہوتا۔

بندہ مومن کی خاصیت

بے فکری کی نیند نہ سونا

فرمایا: میں نے دوزخ سے بھاگنے والے (بچنے والے) کسی شخص کو سوتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی جنت کی خواہش رکھنے والے کسی شخص کو سوتے ہوئے دیکھا۔ (ترمذی)

یہ حدیث شریف بتاتی ہے کہ مومن پر آخرت کی فکر اتنی غالب ہوتی ہے کہ وہ بے فکری کی نیند نہیں سوتا، وہ سوتا اس لئے ہے تاکہ جسم وجان میں اتنی توانائی آسکے کہ وہ عبادت اور ذکر وفکر کرسکے اور خدمت دین کا کام کرسکے، اس طرح کی توانائی کے حصول کے علاوہ وہ نیند میں وقت ضایع نہیں کرتا، یہ بندہ مومن کی خصوصیت ہوتی ہے، وہ جہنم کی سزا سے بچنے اور اللہ کی رضا کی جگہ جنت میں داخل ہونے والے اعمال میں ہی وقت صرف کرتا ہے، سونا چونکہ انسان کی فطری ضرورت ہے، نیند کے بغیر اس کے اعضائے جسم کام کرنے کے قابل نہیں ہوتے، اس لئے ضرورت سے زیادہ نہیں سوتا، اللہ کے عتاب سے بچاؤ اور اللہ کی رضا والے اعمال اسے ضرورت سے زائد نیند ہی نہیں کرنے دیتے۔

حکمران اور عہدوں کے حامل

افراد کے بارے میں

فرمایا: مسلمان رعیت پر حکومت کرنے والا حاکم اگر اس حال میں مرا کہ وہ اپنی رعیت سے دھوکہ کررہا ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کردیتا ہے۔ (بخاری شریف)

یہ ایک المناک بات ہے کہ عام طور پر حکومت اور سرکاری عہدے اس لئے حاصل کئے جاتے ہیں، تاکہ اپنے حب جاہ وحب مال کے جذبات کی تسکین حاصل کی جاسکے، اس مقصد کے لئے ظلم، لوٹ مار، اشیائے ضرورت کی مہنگائی اور لوگوں کی حق تلفیوں، اپنے مخالفین کو نشانہ انتقام بنانا وغیرہ یہ ساری چیزیں ان کا وظیفہ بن جاتی ہے، بہت کم حکمران اور عہدیدار ہوتے ہیں، جو اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاکر اس طرح کی کارروائیوں سے محفوظ ہوں، حکومت اور عہدوں میں کچھ اس طرح کی خاصیت رکھی گئی ہے کہ اس کی وجہ سے مزاج میں فساد پیدا ہوجاتا ہے، اس لئے عہدوں سے پناہ مانگی گئی ہے کہ اس کی وجہ سے

نیک سے نیک فرد بھی حالت خطرہ میں آجاتا ہے، اور نفس کی بے قابو قوتیں انہیں حب جاہ وحب مال کی راہ پر لگانے پر اکساتی رہتی ہیں اور عام لوگوں کے حقوق غصب کرنے پر بھی۔

ایسے لوگوں کو جنت سے محرومی کی نوید سنائی گئی ہے، اس انتباہ کے باوجود حکومت اور عہدوں کے حصول کے لئے دوڑ شروع ہو جاتی ہے، حالانکہ اس طرح کے عہدے آگ کو اپنے ہاتھ میں لینے کے مترادف ہوتے ہیں۔

بدزبان اور بدمزاج فرد کا حشر

فرمایا: بدزبان اور بدمزاج فرد جنت میں نہیں جائے گا۔ (ابوداؤد)

بدزبان اور بدمزاج شخص دوسروں کی تکلیف اور اذیت کا باعث بنتا ہے، اس سے خیر کی امید نہیں رکھی جاتی، اس کی بدزبانی کے ذریعہ تلخیاں پیدا ہوتی ہیں، اس کی بدمزاجی کی وجہ سے لوگ اس کے شر سے پناہ مانگنے لگتے ہیں، ان دونوں خرابیوں کی وجہ سے اس کی شخصیت، افراد معاشرہ کو جوڑنے کی بجائے توڑنے کا ذریعہ بن جاتی ہے، جہاں یہ مزاجی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، وہاں دوسری بہت ساری خرابیاں اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہو جاتی ہیں۔

زبان کو لگام دینے اور مزاج میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے اپنے آپ کو کنٹرول کرنا پڑتا ہے، اور تربیت کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

یہ دونوں ایسی بیماریاں ہیں جو معاشرہ میں بڑھتی جارہی ہیں، اس کی وجہ سے بہت ساری معاشرتی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ایسے افراد کو جنت میں داخل نہ ہونے کا انتباہ دینا، یہ بہت بڑا انتباہ ہے، اس کی وجہ سے ہمیں اپنی زبان پر قابو پانے اور مزاج کو معتدل بنانے کے سلیقہ سے آشنا ہونا پڑے گا، یہ ہماری نجات کا سوال بھی ہے۔

عالموں کی قدر و قیمت
ان کی قلم کی روشنائی کا
شہیدوں کے خون پر بھاری ہونا

فرمایا: اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے، اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ (بخاری شریف)

فرمایا: قیامت کے دن عالموں کے قلم کی روشنائی شہیدوں کے خون پر بھاری ہو گی۔ (کنزالعمال)

علماء کی اہمیت کے بارے میں اس طرح کی متعدد حدیثیں وارد ہیں، چونکہ علم دین کا تسلسل علماء ہی کا مرہون منت ہے، اس لئے علماء کی اہمیت مسلمہ ہے۔

علماء اور اہل علم کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ وہ علم سے اپنے آپ کو نفع پہنچانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی رہنمائی کا بھی کردار ادا کرتے ہیں، اور حق و باطل میں تمیز پیدا کرنے کا شعور اجاگر کرتے ہیں، بے علمی کے اندھیروں میں علم کی روشنی پھیلاتے ہیں نیز ہر دور میں اسلام کے دفاع کا کردار ادا کرتے ہیں، پہلی حدیث شریف بتاتی ہے کہ دین کا حقیقی فہم اللہ کی دین ہے، یہ اللہ تعالیٰ اسی کو عطا فرماتے ہیں، جس کے ساتھ اللہ کا فضل خاص شامل ہوتا ہے۔

اس طرح کے شخص کی خوش بختی یہ ہے کہ اس کی ساری زندگی علم دین کو پھیلانے اور اسے فروغ دینے میں صرف ہوتی ہے، حالات چاہے کیسے بھی نامساعد ہوں، دین کی طرف لوگوں کا رجوع ہو یا نہ ہو، ریاستی اداروں کی طرف سے دینی تعلیم سے کتنی ہی بے رغبتی ہو، لیکن دین کا عالم زمانہ کے سارے تھپیروں کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی اپنی توانائیاں دین کی اشاعت میں صرف کرتا ہے، اسے اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے، وہ زمانہ کی بے رحم موجوں کے باوجود نامساعد حالات میں دین کے فروغ اور اس کے

تسلسل کو قائم رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہوتا ہے، اس طرح کے عالم کے بارے میں متعدد احادیث میں خوش خبریاں ہیں اور انہیں بنی اسرائیل کے انبیاء کے مثل قرار دیا گیا ہے۔

دوسری حدیث میں دین کی اشاعت یعنی کتابوں کی تحریر میں استعمال ہونے والی سیاہی کو شہیدوں کے خون سے افضل قرار دیا گیا ہے، یہ حدیث شریف اہل علم کی طرف سے دین کے لئے اشاعت کے محاذ پر دی جانے والی خدمات کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے، بالخصوص اسلام کی مظلومیت اور لادینیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے دور میں یہ کام سرانجام دینا غیر معمولی اجر وثواب کا باعث ہے۔

اس دور میں جب کہ علماء اور اہل علم کی قدر نہ ہونے کے برابر ہے، سارے ریاستی ادارے آزاد خیالی کو فروغ دے رہے ہیں، ایسے حالات میں جو علماء، دین کا حقیقی فہم حاصل کرکے، موجودہ دور کے حالات کے تناظر اور جدید ذہنی اور علمی سطح کے مطابق اسلام کی پیشکش کا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں، وہ اللہ کی نظر میں غیر معمولی قدر وقیمت کے حامل ہیں، ایسے لوگوں کے قلم کی سیاہی شہیدوں کے خون سے افضل ہے، یہ بہت بڑی سعادت کی بات ہے۔

علماء کو مادہ پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے بے نیاز ہو کر، فقر وزہد کے ساتھ فروغ دین اور اشاعت کا کام کرنا چاہئے، اللہ کے دین کے لئے اخلاص سے کام کرنے والوں کو اللہ تنہا نہیں چھوڑتا، اللہ ان کی نصرت کی صورتیں پیدا فرماتا رہتا ہے۔

قیامت میں اللہ کے عرش کا سایہ ملنے والے سات قسم کے خوش نصیب افراد

فرمایا: جس دن کوئی سایہ نہ ہوگا، اس دن اللہ تعالیٰ سات قسم کے افراد کو اپنے عرش کے سایے میں جگہ دے گا، (۱) عادل حکمران (۲) اللہ کی عبادت میں مشغول حکمران (۳) وہ شخص جس کا دل مسجد سے نکلنے کے بعد دوبارہ مسجد میں جانے کے لئے بے قرار ہو (۴) اللہ کے لئے ایک دوسرے سے محبت کرنے والے، جن کا ملنا اور جدا ہونا خالص اللہ کے لئے ہو، (۵) وہ شخص جو تنہائی میں اللہ کا ذکر کرتا رہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے (۶) وہ شخص جسے کسی بڑے خاندان کی خوبصورت عورت نے گناہ کی دعوت دی ہو اور اس نے کہا میں اللہ سے ڈرتا ہوں (۷) وہ شخص جس نے اس طرح چھپا کر اللہ کے لئے صدقہ دیا ہو کہ بائیں ہاتھ کو بھی علم نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا صدقہ دیا۔ (ترمذی)

یہ حدیث شریف اپنے مفہوم ومعنیٰ میں بالکل واضح ہے، اس میں نوجوانی کی حالت میں عبادت کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے تو ساتھ ساتھ مسجد سے دل کے غیر معمولی تعلق کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی، اللہ کے لئے ایک دوسرے سے ملنے اور محبت کرنے کے اس عمل کی اہمیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔

ہمیں اگر ان کاموں میں سے ایک دو خصوصیات بھی حاصل ہوں تو یہ ہماری بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی، بالخصوص مسجد سے دلی لگاؤ کا ہونا اور ایک دوسرے سے محض اللہ کے لئے ملنے کے اہتمام کا ہونا، عبادت سے شغف کا ہونا یہ کام ایسے ہیں، جو ہم کوشش سے کر سکتے ہیں، اس طرح اللہ کے سایے کے مصداق بن سکتے ہیں۔

تقویٰ اور اخلاق حسنہ کی اہمیت

آپ سے دریافت کیا گیا کہ وہ کونسا عمل ہے جو لوگوں کے لئے جنت میں داخلہ کا ذریعہ بنے گا۔ فرمایا: تقویٰ اور حسن اخلاق، پھر دریافت کیا گیا کہ کون سا عمل لوگوں کے لئے سب سے زیادہ جہنم میں داخل ہونے کا سبب ہوگا، فرمایا: زبان اور شرمگاہ۔ (ترمذی)

اس حدیث شریف سے تقویٰ اور اخلاق حسنہ کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے، تقویٰ ایسی چیز ہے جو ہر قسم کی بُرائی سے بچانے اور ہر نیکی پر عمل کرنے پر اکسانے کا باعث بنتی ہے، اخلاق حسنہ کی سعادت بھی تقویٰ کے ذریعہ ہی پیدا ہوتی ہے، تقویٰ دراصل ہر وقت اللہ کے کھٹکہ کے غالب ہونے کا نام ہے، جب یہ کھٹکہ پیدا ہوتا ہے تو فرد کے لئے بُرائی سے بچنا اور نیکی کے کام کرنا آسان ہونے لگتا ہے، اخلاق حسنہ تو ایسی چیز ہے، جو انسانیت کی معراج ہے، جو شخص

اخلاق میں جتنا زیادہ بلند ہوگا، اسی قدر اللہ کے ہاں اس کا مقام بلند ہوگا، اخلاق حسنہ کی برکت سے لوگوں میں بھی اسے محبوبیت حاصل ہوگی، اس لئے کہ لوگوں کے دلوں کو جیتنا، یہ اخلاق کی خصوصیات میں شامل ہے۔

اس دور میں زبان اور شرمگاہ کے فتنہ سے بچنا سخت دشوار ہے، لیکن اس کے بغیر جہنم سے بچنا دشوار تر عمل ہے، اس لئے ان دونوں سے ہر ممکن حد تک بچنے کے لئے کوشاں ہونا، فرد کی نجات کے لئے ضروری ہے۔

دعا نہ مانگنے والے سے
اللہ کا ناراض ہونا

فرمایا: جو شخص اللہ سے دعا نہیں مانگتا، اللہ اس سے ناراض ہوتا ہے۔

دعا مانگتے رہنا عبدیت کی علامت ہے، ہر شخص دین و دنیا اور دنیا و آخرت میں درپیش مشکلات سے بچاؤ کے لئے ہر وقت اللہ کی مدد کا محتاج ہے، یہ دعا ہی ہے جو اللہ کی مدد کو اپنے ساتھ لاتی ہے، دعا سے دل کو تسکین بھی ملتی ہے کہ میں نے اس ہستی سے مانگا ہے، جس کے خزانے ختم ہونے والے ہی نہیں، دعا کو عبادت کی روح قرار دیا گیا ہے، دعا نہ مانگنے پر اللہ کا ناراض ہونا، یہ بندہ کو اکساتا ہے کہ وہ اپنی ہر ضرورت کے لئے اپنے مولا کی طرف رجوع ہو، دعا، دل کی گہرائیوں سے مانگی جائے تو قبولیت کے زیادہ آثار ہوتے ہیں، دعا کی قبولیت کی تین صورتیں ہیں، ایک یہ کہ وہی چیز عطا کی جائے، جو مانگی گئی ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ چیز تو عطا نہ ہو، لیکن آنے والی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت ٹال دی جائے، دعا کی قبولیت کی تیسری صورت یہ ہے کہ دعا کو آخرت میں بندہ مومن کے لئے ذخیرہ اعمال کے طور پر جمع کیا جائے۔

دعا سے اللہ سے قرب کے مقامات بھی حاصل ہوتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ دل کو ماسوا سے خالی کر کے دعا مانگنے کو معمول بنایا جائے تو فرد دیکھے گا کہ اس کے مشکل سے مشکل مسائل کے حل کی صورت پیدا ہوتی جائے گی اور اس کی مشکلات کے احساس میں کمی آتی جائے گی، دل کی حضوری کے بغیر دعا زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوتی، اس سلسلے کا ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔

ایک شخص اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کر رہا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہاں سے گزر ہوا، آپ اسے دیکھتے رہے، آپ نے کہا، یا اللہ اگر میرے پاس اس کی حاجت ہوتی تو ضرور پوری کرتا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ میں تم سے زیادہ اس پر رحم کرنے والا ہوں، مگر وہ مجھے پکارتا تو ہے لیکن اس کا دل بکریوں کے ساتھ ہے۔

ہمارے دل کی بھی عام طور پر یہی حالت ہوتی ہے کہ دل دنیا کی محبت سے لبریز ہوتا ہے، بظاہر دعا مانگ رہے ہوتے ہیں، دل کو دنیا کی محبت سے خالی کر کے مانگا جائے تو اللہ اتنا عطا فرماتے ہیں کہ فرد کے وہم و گمان سے بھی زیادہ۔

اللہ ایسے شخص سے ناراض ہوتا ہے، جو اس سے نہیں مانگتا، خیر، دعا اگر دنیا کی محبت سے خالی نہ ہو، تب بھی مانگتے رہنا چاہئے، اس لئے کہ اللہ سے مانگنا عجز کی علامت ہے اور عبدیت کی بھی۔

گناہ سے توبہ کرنے والے نے گویا
گناہ کیا ہی نہ ہو

فرمایا: گناہ سے توبہ کرنے والا شخص اس شخص کی طرح ہے، جس نے گویا گناہ کیا ہی نہ ہو۔

یہ اللہ کی بڑی فیاضی، عطا اور شان رحیمی ہے کہ وہ سچی توبہ سے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے اور ان گناہوں کو گناہوں کی فہرست میں شامل کرنے سے نکال دیتا ہے، یہ گناہگار بندہ مؤمن کے لئے کتنی بڑی خوش خبری ہے، ایسی خوش خبری، جس پر بندہ عجز و انکساری کے ساتھ جتنی بھی خوشی منائے، کم ہے، بندہ ہر وقت نفس، شیطان اور مادیت پسند قوتوں کے

گھیراؤ میں رہتا ہے، کوشش کے باوجود اگر پھر گناہ ہو جائے تو دل کی گہرائیوں سے توبہ کر کے پھر اعمال کرنے کی کوشش کرے۔

نیکی کے کسی کام کو معمولی نہ سمجھنا

فرمایا: نیکی کے کاموں میں کسی کام کو معمولی نہ سمجھا کرو، اگرچہ اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ہی ملو۔

نیکی کا ہر کام ایسا ہے جو بندہ کی ناگزیر ضرورت ہے، بڑا کام تو خیر، اہم ہے ہی، لیکن نیکی کے چھوٹے کام کی بھی حیثیت ہے، اسے چھوٹا کام سمجھکر نہ کرنا یہ غلطی ہے، اس لئے کہ معلوم نہیں کر سعادت کا تالہ کس چابی سے کھلے۔

دنیا کی زندگی نیکی کمانے ہی کے لئے ملی ہے، اس لئے چھوٹی سی چھوٹی نیکی کو سعادت سمجھکر کرنا چاہئے، چھوٹی چھوٹی نیکیاں جمع ہو کر بڑی نیکیاں شمار ہو جاتی ہے، اس سلسلے میں دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ چھوٹی نیکیاں چھوٹ جانے سے خطرہ موجود ہوتا ہے کہ کہیں رفتہ رفتہ بڑی نیکیاں بھی چھوٹ نہ جائیں۔